Registered No. L. 4186

شعبان ۱۳۶۱ھ
البقرہ (رکوع ۳۲ تا ختم)

جلد ۲۱ - عدد ۲

۸۶ء

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک - پونچھ روڈ - لاہور

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یکتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل
سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں
یلی ہوئی ہیں ۔ مثلاً توحید ' ہدایت و ضلالت' عبادت' جہاد' آزادی' رواداری'
یت اسلامی ' عقیدۂ توحید کے ساتھہ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا' رسول کی
یح حیثیت' رسالت محمدی کا ثبوت عقلی' شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت
ن اور حدیث کا باہمی تعلق' منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔
حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

یمت حصہ اول بیجلد دو روپے قیمت مجلد دو روپیہ آٹھہ آنے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب
کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور
تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے
مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب
پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش
کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت
عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۸/- مجلد ۲/-/- محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

بابت شعبان سنہ ۶۱ھ (ستمبر سنہ ۴۲ء) جلد ۲۱ - عدد ۳

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۷۴
تفہیم القرآن	"	۲۸۱

مقالات:-

جماعت اسلامی اور ہمارا کام	از مولانا منظور صاحب نعمانی	۳۰۳
الصوم	مولانا سید محمد جعفر صاحب پھلواروی	۳۲۲

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس

سرکلر روڈ میں طبع ہوکر دفتر "ترجمان القرآن" - لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کی اشاعت میں ایک مدت سے جو بے قاعدگی چلی آرہی ہے اس کی وجہ سے ناظرین کو سخت شکایت ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح رسالہ کی اشاعت اپنے وقت پر ہونے لگے، اور اسی غرض کے لیے متعدد مرتبہ کئی کئی مہینوں کے پرچے ملا کر یکجا شائع کیے مگر اس کے باوجود اشاعت کا نظام درست کرنے میں مجھے ناکامی ہوئی۔ اب اس خرابی کا کوئی علاج اس کے سوا نظر نہیں آتا کہ جمادی الاولیٰ جمادی الآخرہ اور رجب کی اشاعت منسوخ کرکے شعبان کا پرچہ شعبان ہی میں شائع کر دیا جائے اور منسوخ شدہ مہینوں کے عوض تمام خریداروں کی مدتِ اشاعت میں ۳ مہینہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق اب یہ شعبان کا پرچہ شائع ہو رہا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آئندہ کے لیے رسالہ کی اشاعت کا نظام درست رہے۔

پریس اور کاغذ کے لیے ہم نے اپنے ہمدردوں سے اعانت کی درخواست کی تھی اس کے جواب میں ۵ ستمبر تک جو رقمیں وصول ہوئی ہیں ان کی مجموعی مقدار دو ہزار سات سو چھبیس روپے ہے۔ اس میں سے ۱۶۲۶ روپے بطور اعانت آئے ہیں اور ۱۱ سو روپے بطور قرض۔ پریس خرید لیا گیا ہے اور یہاں لا کر نصب کیا جا چکا ہے۔ اب صرف بجلی کی امداد اور ڈیکلریشن کی منظوری کا انتظار ہے۔ یہ دو مرحلے طے ہونے کے بعد ان شاء اللہ ہماری مطبوعات خود اپنے پریس میں طبع ہونے لگیں گی۔ اب دوسری اہم ضرورت کاغذ کے ذخیرہ کی فراہمی ہے جس کے لیے ہم پوری جدوجہد کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں بھی ہم کو مزید اعانت کی ضرورت ہے۔

ربیع الآخر کی اشاعت میں جس درسگاہ کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا اس کے لیے ابھی ابتدائی انتظامات بھی پوری

طرح نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہم نے ابھی صرف تجویز کا اظہار کیا ہے، قیام کا اعلان نہیں کیا ہے۔ لہٰذا کوئی صاحب اس غلط فہمی کی بنا پر اپنے بچے یہاں نہ بھیج دیں کہ باقاعدہ کام شروع ہو چکا ہے جن حضرات کا ارادہ اپنے بچے یہاں بھیجنے کا ہو وہ سر دست ہم کو صرف اپنے ارادے سے آگاہ کر دیں اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیں کہ بچے کی عمر کیا ہے، اس کی اب تک کی تعلیم کس نوعیت کی اور کس حد تک ہوئی ہے، اور وہ اس کے تعلیمی خرچ کا کس قدر بار اُٹھا سکتے ہیں جب ہم اپنے انتظامات مکمل کر لیں گے تو ان کو اطلاع دیدیں گے۔

نئے مرکز کی تاسیس اور جماعت کے آئندہ کام کے سلسلہ میں اس وقت چند ایسے اہم مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے جماعت کی مجلسِ شوریٰ کا انعقاد ناگزیر ہو گیا ہے اگرچہ ان مسائل کی نوعیت تو اس کی متقاضی تھی کہ اجتماع عام کی دعوت دی جائے لیکن ملک کے موجودہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے، لہٰذا مجبوراً یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ شوال کے دوسرے ہفتہ میں صرف اصحابِ شوریٰ کو مجتمع کر کے ان امور کا تصفیہ کر لیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ اس مشورہ میں ہم کو ایسے فیصلے کرنے پڑیں جن کا جماعت کے نظام اور اس تحریک کے مستقبل پر غیر معمولی اثر مترتب ہو، لہٰذا میں رفقائے جماعت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اصحابِ شوریٰ کے خلوص اور ان کی اصابتِ رائے پر پوری طرح اعتماد کریں اور اطمینان رکھیں کہ اس مقصدِ عظیم کی خدمت کے لیے بہتر سے بہتر ممکن صورت اختیار کرنے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ شوریٰ کے لیے ۸ شوال مقرر کی گئی ہے اور ارکانِ شوریٰ کی سہولت کے لیے مقامِ اجتماع دہلی تجویز ہوا ہے۔

"تفہیم القرآن" میں آیت وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (رکوع ۲۴) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ "باز آ جانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آ جانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آ جانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے، ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھنا ہے رکھے اور جس کی چاہے عبادت کرے یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اسے فہمائش اور نصیحت کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں لیکن اسے یہ حق ہرگز

نہیں ہو کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کریں اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا کسی کا بندہ بنائیں یہ فتنہ بزور شمشیر مٹایا جائے گا اور مومن کی تلوار اس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی اس روش سے باز نہ آجائیں"۔ اس تفسیر کے خط کشیدہ فقرے پر ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب علم بزرگ نے حسب ذیل اعتراض کیا ہے:

"(ا) اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام جو امن اور سلامتی کا حامی اور مؤید ہے، دوسروں کے مذہب میں مداخلت اور اس بنا پر لڑائی روا رکھتا ہے حالانکہ یہ امر لا اکراہ فی الدین کے مخالف ہے۔

(ب) مخالفین کو اپنے اپنے مذہب اور عقائد پر قائم رہنے کی آزادی لکم دینکم ولی دین سے بھی ظاہر ہے۔ جو کوئی اپنے عقائد میں آزاد ہوگا اسے ان کی اشاعت اور تبلیغ میں بھی آزادی ہونی چاہیے کیونکہ وہ انہی عقائد کو برحق سمجھتا ہے۔ قرآنی مفہوم سے اسی آزادی کا پتہ چلتا ہے اور باہمی مناظرات کا ثبوت بھی ملتا ہے، مثلاً لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ غیر مذاہب کے عبادت خانے اور طریق عبادت اسلامی مداخلت سے محفوظ رہے ہیں حتیٰ کہ مسجد نبوی میں اہل کتاب کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دی گئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی ملازمت اختیار کی جس کا عقیدہ اور عمل مشرکانہ تھا وہاں اپنے طور پر امن کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے جیسا کہ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ سے ظاہر ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی اپنے خیالات و عقائد کی اشاعت کا حق پہنچتا ہے۔

(ج) زیر خط عبارت کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمان کہیں بھی مخلوط آبادی میں امن سے زندگی نہیں گزار سکتے۔ غیر مسلم تمدنی اور معاشرتی امور میں بھی کیوں ان کے ساتھ تعاون باہمی اور رواداری سے کام لیں جب کہ ان کا سیاسی اور اساسی عقیدہ ہی ستیزہ ہو؟ ایسے مسلمان اگر ترکی اور ایران میں بھی آباد ہوں تو بقول آپ کے وہاں بھی انہیں علم جہاد بلند کرنا ہوگا کیونکہ ان ممالک میں حدود اور قوانین اسلامی نافذ نہیں۔ اس زمانہ میں عالمگیر سیاست اس نہج پر مدون ہے کہ کوئی جماعت غیر معروف طریق

سے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل باہمی سے کام نہیں لے سکتی کیونکہ آپ کا فرمودہ استدلال کسی اشتراکِ عمل کے لیے مانع ہوگا۔ اگر اسلامی جماعت اپنے عقائد کی اشاعت کا حق رکھتی ہے تو اسے غیر مسلموں کو بھی، خصوصاً جب کہ وہ حکمراں ہوں وہی حق دینا ہوگا۔ ہر چہ برخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند۔ رسول اکرم صلعم نے مدینہ منورہ کے اہلِ کتاب کے ساتھ جو تعاملِ باہمی کے معاہدے کیے تھے کیا وہ معاہدے ایسی شرائط پر مبنی تھے؟ مکی زندگی کے ابتدائی مراحل آپ کے استدلال کے مؤید نہیں۔ بالفاظ دیگر ایسی جماعت کا وجود ہی کسی غیر مسلم حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہے کہ جونہی اسے قوت ملی وہ اس کے قوانین اور اس کے نظامِ حکومت کو مٹانے کے لیے تلوار ہاتھ میں لے لے گی کون اس کو برداشت کرے گا؟

اس اعتراض کا مختصر جواب خط کے ذریعہ سے دیا جاسکتا تھا لیکن یہ اعتراض جس طرزِ خیال کی ترجمانی کر رہا ہے وہ آج کل عام طور پر پھیلا ہوا ہے، اور قریب قریب ہر جگہ وہی دلائل اس طرزِ خیال کی تائید میں دہرائے جاتے ہیں جو صاحب معترض نے تحریر فرمائے ہیں اس لیے یہاں اسے نقل کر کے جواب دیا جارہا ہے۔

یہ بحث تو بعد میں ہوتی رہے گی کہ اسلام امن اور سلامتی کا مؤید کس معنی میں ہے اور لا اکراہ فی الدین اور لکم دینکم ولی دین کا کیا مطلب ہے اور یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبوت کرنے آئے تھے یا تلاشِ روزگار میں نکلے تھے۔ ان سب باتوں سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا چاہیے کہ فی الواقع اسلام کا مشن اس دنیا میں ہے کیا۔ کیا وہ جباروں کی سواری کے لیے انسانوں کو سدھانے آیا ہے تاکہ ہر جبار جب دنیا میں خدائی کرنے اٹھے تو اسلام کے پیرووں کو اپنا اطاعت گزار خادم پائے؟ کیا اس نے دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں کے لیے پُرامن رعیت فراہم کرنے کا اجارہ لیا ہے کہ ہر حکومت کو اپنی مشینری چلانے کے لیے اسلام کے کارخانہ سے ہر قسم کے ڈھلے ڈھلائے پرزے حاصل ہو جایا کریں، قطع نظر اس سے کہ حکومت کا نظام کچھ ہو؟ کیا اس کا کام بس یہی ہے کہ چند عقائد اور چند اصول اخلاق کی تعلیم دے کر آدمیوں میں اتنی لچک اور اتنی نرمی پیدا کر دے کہ وہ ہر نظامِ تمدن میں بآسانی کھپ سکیں بلا لحاظ اس کے کہ اس نظام کی نوعیت کیسی ہی ہو؟

اگر معاملہ حقیقت میں یہی ہے تو اسلام بودھ مذہب اور سینٹ پال کی بنائی ہوئی مسیحیت سے کچھ بہت زیادہ مختلف چیز نہیں ہے اور یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے مذہب کی کتاب میں قاتلوھم جیسا خوفناک لفظ سرے سے آیا ہی کیوں۔ اسے تو اپنے پیروؤں کو جنگ اور جہاد کا حکم دینے کے بجائے اپنے مخالفین سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ہم غریبوں کو آخر کیوں مارتے ہو؟ ہم نہ نظامِ حکومت میں کوئی انقلاب کرنا چاہیں نہ نظامِ تمدن میں کسی ترمیم و تنسیخ کی دعوت دیں، اقتدار کسی کا ہو اس کے ماتحت پُرامن باشندوں کی حیثیت سے رہنا ہمارا مسلک اور حکومتِ وقت کی وفاداری ہمارا دین و ایمان، پھر ہم سے تمھیں پرخاش کی کیا وجہ؟ رہا ہمارا مذہبی عقیدہ اور ہمارا پوجا پاٹ کا نظام تو اس سے تمھارا کیا بگڑتا ہے، تمھارا کونسا تمدنی ادارہ اور کونسا مفاد ایسا ہے جس پر ہمارے عقیدے یا ہماری پوجا کی ضرب پڑتی ہو۔ یہ جواب اگر اچھے معقول پیرایہ میں دیا جاتا اور عملاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو وفاداری کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تو مشرکینِ مکہ ہمارے انگریز آقاؤں کے مقابلہ میں کچھ ایسے زیادہ نامعقول نہ تھے کہ مسجدوں میں اذان و نماز کی آزادی اور تبلیغی انجمنوں کے قیام کی اجازت نہ دیتے۔

لیکن اگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اسلام خود اپنا ایک نظامِ زندگی رکھتا ہے جس میں عقائد، اخلاق اور عبادات کے ساتھ انفرادی طرزِ عمل اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام و قوانین بھی ہیں، اور اسلام کی دعوت اپنے اس پورے نظام کی طرف ہے، اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہی نظام حق ہے اور اسی میں انسان کی فلاح ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا نظام باطل ہے، تو اس کے ساتھ یہ قطعی ناگزیر ہے کہ وہ زمین میں اپنے نظام کے قیام اور دوسرے نظامات کے مٹانے کا بھی متقاضی ہو۔ کیونکہ اول تو ایک نظامِ زندگی کو حق اور صدق ہونے کی حیثیت سے پیش کرنا اور پھر عملاً اس کی اقامت کی دعوت نہ دینا سراسر ایک مہمل بات ہے اور اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ دوسرے نظامات کو باطل بھی کہا جائے اور ان کے وجود کو برداشت بھی کیا جائے۔ دوسرے یہ بات بداہتہً محال ہے کہ ایک نظامِ زندگی کی

پیروی کسی دوسرے نظامِ زندگی کے ماتحت رہتے ہوئے کی جاسکے اس لیے وہ صرف ایک فاترالعقل ہی ہوسکتا ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے پیش کردہ نظام کی پیروی کا مطالبہ بھی کرے اور ساتھ ہی دوسرے نظامات کے اندر پُرامن وفادارانہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم بھی دے۔ پس اسلام کا ایک نظامِ زندگی کی طرف دعوت دینا عین اپنی فطرت میں اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ دوسرے نظامات کو مٹا کر ان کی جگہ اپنے نظام کی اقامت کا مطالبہ کرے، اور اس مقصد کے لیے اپنے پیروؤں کو جدوجہد کی ان تمام صورتوں کے اختیار کرنے کا حکم دے جن سے یہ مقصد حاصل ہوا کرتا ہے، اور مدعیانِ اتباع کے ایمان وعدمِ ایمان کا نشانِ امتیاز اسی کو قرار دے کہ آیا وہ اس جدوجہد میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں یا باطل نظامات کے ماتحت جینے پر راضی رہتے ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ کو صاف نظر آجائے گا ـــــ بشرطیکہ دل میں کوئی چور نہ ہو ـــــ کہ اسلام نے یہی دوسری پوزیشن اختیار کی ہے نہ کہ پہلی۔

جب حقیقت یہ ہے اور ہم اسلام کی اس حقیقت کو جان کر اس پر ایمان لائے ہیں تو یقیناً ہمارے وجود کو ہر غیر اسلامی حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہونا چاہیے۔ کوئی اس کو برداشت کرے یا نہ کرے، غیر مسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل ہوسکے یا نہ ہوسکے، بہرحال اگر ہم اپنے ایمان میں صادق ہیں تو ہمارا کام یہی ہے کہ جہاں بھی خدا کا قانونِ شرعی نافذ نہیں ہے وہاں اس کے نفاذ کے لیے عَلَمِ جہاد بلند کریں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں وہ اسے برداشت بھی کریں، اور نہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل ہمارے لیے اس قدر قیمتی ہے کہ جس نظامِ زندگی پر ہم ایمان لائے ہیں اس کے قیام کی جدوجہد صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل اس صورت میں نہ ہوسکے گا۔ اسلام بے شک امن اور سلامتی کا حامی اور مؤید ہے، مگر اس کی نگاہ میں امن اور سلامتی

وہی ہے جو حدود اللہ کی اقامت سے حاصل ہوتی ہے جس کسی نے امن اور سلامتی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شیطانی نظامات کے زیر سایہ اطمینان کے ساتھ سارے کاروبار چلتے رہیں اور مسلمان کی نکسیر تک نہ پھوٹے، اس نے اسلام کا نقطۂ نظر بالکل نہیں سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ اسلام ایسے امن اور ایسی سلامتی کا ہرگز حامی اور مؤید نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے اور اسی میں انسان کی سلامتی دیکھتا ہے۔

رہا لا اکراہ فی الدین، تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام اپنے عقائد زبردستی کسی سے نہیں منواتا کیونکہ یہ منوانے کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح وہ اپنی عبادات بھی، جن کا لازمی تعلق اس کے عقائد سے ہے، زبردستی کسی پر مسلط نہیں کرتا، کیونکہ ایمانِ صحیح کے بغیر وہ بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں امور میں وہ ہر ایک کو آزادی دینے کے لیے تیار ہے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ قوانینِ تمدن جن پر اسٹیٹ کا نظام قائم ہوتا ہے، خدا کے سوا کسی اور کے بنائے ہوئے ہوں اور خدا کے باغی اُن کو نافذ کریں۔ اس معاملہ میں بہر حال ایک فریق کو دوسرے فریق کے مذہب میں مداخلت کرنی ہی پڑے گی تو بجائے اس کے کہ کافر اہلِ ایمان کے مذہب میں مداخلت کریں، زیادہ بہتر یہ ہے کہ اہلِ ایمان اُن کے مذہب میں مداخلت کریں۔ نہ کریں گے تو خدائی مذہب کا ایک بڑا حصہ معطل ہو جائے گا اور اہلِ ایمان کی زندگی کے ایک بڑے حصہ پر کفار کا مذہب مسلط ہو گا۔

تفہیم القرآن

(۵)

البقرہ

(از رکوع ۳۴ تا ختم سورہ)

اللہ، وہ زندہ خدا جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں،[۱] نہ اسے اونگھ لگتی ہے نہ نیند آتی ہے،[۲] زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے،[۳] کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟[۴] جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے

---

[۱] یہ اور بات ہے کہ نادان لوگوں نے بے شمار دوسرے الٰہ بنا رکھے ہوں مگر حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ اللہ ہی اکیلا اِس کائنات کا سلطانِ مطلق ہے جس کے بل بوتے پر پورا انتظامِ عالم چل رہا ہے لہٰذا فی الواقع صرف وہی ایک الٰہ ہے۔ باقی سارے مزعوم الٰہوں کی الٰہیت جھوٹی اور غیر واقعی ہے۔ اُس کے سوا کوئی دعائیں سننے اور حاجتیں پوری کرنے کا اقتدار نہیں رکھتا، کسی کے پاس قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات نہیں، کسی دوسرے کو اس کی سلطنت میں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جھکایا جائے، کسی کی یہ حیثیت نہیں کہ اس کا حکم قانون ہو اور بے چون و چرا تسلیم کیا جائے، کوئی عیوب و نقائص سے پاک نہیں کہ اسے مقدس و منزہ مانا جائے۔ یہ تمام خصوصیات جو الٰہیت کے لوازم میں سے ہیں تنہا اللہ ہی کے لیے مخصوص ہیں، کسی دوسرے کا اِن میں کوئی حصہ نہیں۔

[۲] یہ ان لوگوں کے خیالات کی تردید ہے جو خداوندِ عالم کی ہستی کو اپنی ناقص ہستیوں پر قیاس کرتے ہیں اور اس کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرتے ہیں جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

[۳] اس فقرے میں اُن مشرکین کے باطل اوہام کا رد کیا گیا ہے جو اپنے اپنے گمانوں کے مطابق خدائی میں دوسری ہستیوں کو شریک ٹھیراتے ہیں۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ زمین و آسمان کا مالک اور ہر اس چیز کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ اس کی ملکیت میں، اس کی تدبیر میں، اس کی پادشاہی و حکمرانی میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، بلکہ جس دوسری ہستی کا بھی تم تصور کر سکتے ہو وہ بہر حال اِس سلطنتِ کائنات کی ایک رعیت ہی ہوگی، پس جو خود مملوک ہو وہ مالک کے ساتھ حقوقِ ملکیت میں شریک کیسے ہو سکتا ہے۔

[۴] یہ اُن مشرکین کے خیالات کا ابطال ہے جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دوسری ہستیوں کے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔[۱] اس کی حکومت[۲] آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے جن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں، وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔[۳]

(بقیہ صفحہ سابق) متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے جس بات پر اڑ بیٹھیں وہ کرا کے چھوڑتے ہیں اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرب ترین فرشتہ اُس پادشاہ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ اس حقیقت کے اظہار سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ اوپر کے فقروں میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود حاکمیت اور اس کے مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کوئی اس کے ہاں ایسا زور آور ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جن یا فرشتے یا دوسری مخلوقات سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ نظامِ عالم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوندِ عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں۔

۲؎ اصل میں لفظ کرسی استعمال ہوا ہے جسے بالعموم حکومت و اقتدار کے لیے استعارہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

۳؎ یہ آیت "آیت الکرسی" کے نام سے مشہور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمل معرفت بخشی گئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اسی بنا پر حدیث میں اس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس محل پر خداوند عالم کی ذات و صفات کا یہ ذکر کس مناسبت سے آیا ہے، تو اسے سمجھنے کے لیے اُس تقریر کی ترتیب پیشِ نظر رہنی چاہیے جو رکوع ۳۲ سے چل رہی ہے۔ پہلے مسلمانوں کو دینِ حق کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جدوجہد کرنے پر اکسایا گیا ہے اور اُن کمزوریوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ فتح و کامیابی کا مدار تعداد اور ساز و سامان کی کثرت پر نہیں بلکہ ایمان، صبر و ضبط اور پختگی عزم پر ہے۔ پھر جنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت وابستہ ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ دنیا کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے وہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے دفع کرتا رہتا ہے ورنہ ایک ہی گروہ کو اگر غلبہ و اقتدار کا دائمی پٹہ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔[۵] صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت[۶] کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ (جس کا سہارا اُس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) مل جاتا تو دوسروں کے لیے جینا دشوار ہو جاتا۔ پھر اُس شبہ کو دفع کیا گیا ہے جو ناواقف لوگوں کے دلوں میں اکثر کھٹکتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے پیغمبر اختلافات کو مٹانے اور نزاعات کا سدِّباب کرنے ہی کے لیے بھیجے تھے اور ان کی آمد کے باوجود نہ اختلافات مٹے، نہ نزاعات ختم ہوئے، تو کیا اللہ ایسا ہی بے بس تھا کہ اس نے ان خرابیوں کو دور کرنا چاہا اور نہ کر سکا؟ اس کے جواب میں بتا دیا گیا کہ اختلافات کو بجبر روک دینا اور نوعِ انسانی کو ایک خاص راستہ پر بزور چلانا اللہ کی مشیت ہی میں نہ تھا: ورنہ انسان کی کیا مجال تھی کہ اس کی مشیت کے خلاف چلتا۔ پھر ایک فقرے میں اُس اصل مضمون کی طرف اشارہ کر دیا گیا جس سے تقریر کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ انسانوں کے عقائد و نظریات اور مسالک و مذاہب خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، بہرحال حقیقتِ نفس الامری یہ ہے جس پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔ انسانوں کی غلط فہمیوں سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ اِس کے ماننے پر لوگوں کو زبردستی مجبور کیا جائے۔ جو اسے مان لے گا وہ خود ہی فائدہ میں رہے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا وہ آپ نقصان اٹھائے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] یہاں "دین" سے مراد اللہ کے متعلق اُس عقیدہ کو تسلیم کرنا ہے جو آیت الکرسی میں بیان کیا گیا ہے۔

[۶] "طاغوت" لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلہ میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اس کی فرماں برداری کا معترف ہو مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اصولاً منحرف ہو کر خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اُس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبہ پر جو بندہ پہنچ جائے اسی کا نام طاغوت ہے۔ اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ طاغوت کا منکر نہ ہو۔

ہے۲۸۵۔ اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں۲۸۶ اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں
کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ۳۴ع
تم نے۲۸۷ اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا۲۸۸؟ جھگڑا اس بات پر

۲۸۵ تاریکیوں سے مراد جہالت کی تاریکیاں ہیں جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح و سعادت کی راہ سے دور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو غلط راستوں میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اور نور سے مراد علمِ حق ہے جس کی روشنی میں انسان اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد کو صاف صاف دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت ایک صحیح راہِ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔

۲۸۶ طاغوت کو بصیغۂ جمع استعمال کیا ہے، اس لیے کہ خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے جو اس کے سامنے ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے، دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے جو اسے جذبات و خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے پھرتا ہے، اور بے شمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں بیوی اور بچے، اعزا و اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور رہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے، اور یہ بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔

۲۸۷ اوپر دعویٰ کیا گیا تھا کہ مومن کا حامی و مددگار اللہ ہوتا ہے اور وہ اسے تاریکیوں سے روشنی میں لاتا ہے اور کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں اور وہ اسے روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اب اسی کی توضیح کے لیے تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ حقیقت پیش کی گئی اور وہ اس کے سامنے لاجواب بھی ہو گیا، مگر چونکہ اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے رکھی تھی اس لیے وضوحِ حق کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آیا اور تاریکیوں ہی میں بھٹکتا رہ گیا۔ بعد کی دو مثالیں دو ایسے اشخاص کی ہیں جنھوں نے اللہ کا سہارا پکڑا تھا سو اللہ ان کو تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں نکال لایا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا ان کو عینی مشاہدہ کرا دیا۔

۲۸۸ اس شخص سے مراد نمرود ہے جو حضرت ابراہیم کے وطن (عراق) کا بادشاہ تھا۔ جب حضرت ابراہیم نے اپنے وطن میں توحید کا اعلان کیا اور ان تمام الٰہوں اور ارباب کی بندگی سے انکار کر دیا جن کی بندگی ان کے اہلِ وطن کر رہے تھے تو رفتہ رفتہ خاندان، برادری، اور قوم سے گذر کر حکومتِ وقت سے ان کے تصادم کی نوبت آئی اور انھیں ایک باغی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

کہ ابراہیم کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اُس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی[۱] جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیم نے کہا، اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا[۲]، مگر اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گذر ایک ایسی بستی پر ہوا[۳] جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری

[۱] ان الفاظ سے جھگڑے کی نوعیت پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ نمرود کو خدا نے جو حکومت دے رکھی تھی اس کے نشہ میں مدہوش ہو کر وہ اس حقیقت کو بھول چکا تھا کہ ملک خدا کا ہے اور اس کی اصل حیثیت مالک کے نائب کی ہے جس کا کام مالک کے احکام کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔ نائب کے بجائے وہ خود مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ (یعنی ربّ) ہونے کا مدعی تھا۔ برعکس اس کے حضرت ابراہیم جس طرح دیوتاؤں کی الٰہیت کے منکر تھے اسی طرح شاہی خاندان کی ربوبیت کا بھی انکار کرتے تھے اور ان کی دعوت یہ تھی کہ تمام حیثیات سے تنہا اللہ ہی اِلٰہ اور رب ہے۔

یہاں یہ بات اور اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نمرود نہ تو اللہ کے وجود اور اس کے خالقِ زمین و آسمان اور مدبرِ کائنات ہونے کا منکر تھا اور نہ خود کائنات کا رب ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا جیسا کہ بعض مفسرین نے غلطی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں اپنے ملک اور اس کے باشندوں کا رب یعنی حاکم مطلق ہوں، میری زبان قانون ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں۔

[۲] اگرچہ حضرت ابراہیم کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم نمرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اُسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں جس کو ابراہیم نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا۔ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی مطلق العنان فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا لہٰذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا تو اس کے لیے حضرت ابراہیم کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کھل جاتی۔

[۳] یہ ایک فضول بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدعا جس کے لیے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

پڑی تھی۔ اُس نے کہا یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟[1] اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ فرمایا "تم پر سو برس اسی حالت میں گذر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے، دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں[2]۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں"۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اور وہ واقعہ بھی پیشِ نظر رہے جب ابراہیم نے کہا تھا کہ "میرے مالک، مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے"۔ فرمایا کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے[3]۔ فرمایا، اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے، پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے، خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار

(بقیہ صفحہ سابق) یہاں ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام، دونوں کے تعین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اس سوال سے یہ مدعا نہیں کہ سائل حیات بعد الموت کے منکر تھے، یا انہیں اس میں شک تھا، بلکہ در اصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے۔

[2] ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دنیا سو برس پہلے مردہ سمجھ چکی تھی، یہ بجائے خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

[3] یعنی وہ اطمینان جو مشاہدۂ عینی سے حاصل ہوتا ہے۔

ع ۳۵

اور حکیم ہے۔[سلہ]

[سلہ] جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں[سلہ] اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

سلہ اِس واقعہ اور اوپر کے واقعہ کی بعض لوگوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہے اُسے اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو کسی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ عام اہلِ ایمان کو اس زندگی میں جو خدمت انجام دینی ہے اس کے لیے تو محض ایمان بالغیب (بے دیکھے ماننا) کافی ہے، لیکن انبیاء کو جو خدمت اللہ نے سپرد کی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انہیں دنیا کو دینی تھی۔ ان کو دنیا سے پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم قیاسات دوڑاتے ہو مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں، تمہارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو اور ہم بینا ہیں۔ اسی لیے انبیاء کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں، ان کو آسمان و زمین کے نظامِ حکومت (ملکوت) کا مشاہدہ کرایا گیا ہے، ان کو دوزخ اور جنت آنکھوں سے دکھائی گئی ہے، اور بعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ ایمان بالغیب کی منزل سے یہ حضرات منصبِ نبوت پر مامور ہونے سے پہلے گذر چکے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کے بعد ان کو ایمان بالشہادۃ کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

سلا اب پھر سلسلۂ کلام اُسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے جو رکوع ۳۲ میں چھیڑا گیا تھا۔ اس تقریر کی ابتدا میں اہلِ ایمان کو دعوت دی گئی تھی کہ جس مقصدِ عظیم پر تم ایمان لائے ہو اس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں برداشت کرو۔ مگر یہ بات کہ ایک گروہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض کے لیے نہیں بلکہ محض ایک بلند اخلاقی مقصد کے لیے مال و دولت لٹائے، اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا معاشی نقطۂ نظر بالکل تبدیل نہ ہو جائے۔ مادہ پرست لوگ جو پیسہ کمانے کے لیے جیتے ہوں اور پیسے پر جان دیتے ہوں اور نفع و نقصان کی میزان ہی پر جن کی نگاہ ہر وقت جمی رہتی ہو، وہ کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصدِ عالیہ کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ بظاہر اخلاقی مقاصد کے لیے کچھ خرچ کرتے بھی ہیں تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔ اس ذہنیت کے ساتھ اُس دین کی راہ میں انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیوی فائدے اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرو۔ ایسے مسلک کی پیروی کے لیے تو دوسری ہی قسم کے اخلاقیات درکار ہیں۔ اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلہ کی فراخی، دل کی کشادگی اور سب سے بڑھ کر خالص خدا طلبی کی ضرورت ہے، اور اجتماعی زندگی کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نشو و نما پائیں۔ چنانچہ یہاں سے مسلسل تین رکوعوں تک اسی ذہنیت کی تخلیق (باقی اگلے صفحہ پر)

دانہ بویا جائے تو اُس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی[۳۰۱]۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرکے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں[۳۰۲]۔ ایک میٹھا بول، اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس صدقہ[۳۰۳] سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو، اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے[۳۰۴]۔ اے ایمان لانے والو!

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔

۳۰۰ مال کا خرچ خواہ اپنے اعزہ واقربا کی خبرگیری میں ہو یا محتاجوں کی اعانت میں، یا رفاہ عام کے کاموں میں، یا اشاعت دین اور جہاد کے مقاصد میں، بہرحال اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لیے ہے تو اس کا شمار اللہ ہی کی راہ میں ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۳۰۱ یعنی جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبہ کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اتنا ہی اللہ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ جو خدا ایک دانہ میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اُگ سکتے ہیں اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمہاری خیرات کو بھی اسی طرح نشوونما بخشے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گونہ ہو کر تمہاری طرف پلٹے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی دو صفات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فراخ دست ہے، اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمہارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو وہ نہ دے سکے۔ دوسرے یہ کہ وہ علیم ہے، بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبہ سے کرتے ہو، اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمہارا اجر مارا جائے۔

۳۰۲ یعنی نہ تو ان کے لیے اس بات کا خوف ہے کہ ان کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نہ کبھی یہ نوبت آئے گی کہ وہ اپنے اس خرچ پر پشیمان ہوں۔

۳۰۳ صدقہ کا لفظ صدق سے نکلا ہے جس کے اصل معنی سچائی کے ہیں، اور اس سے مراد وہ خیرات ہے جو خدا پرستی کے سچے جذبے سے کی جائے۔ اصطلاحاً صدقہ اور زکوٰۃ میں یہ فرق ہے کہ جو خیرات شرعاً لازم کی گئی ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے، اور جو خیرات رضا کارانہ اپنی خوشی سے کی جائے اس کو صدقہ کہتے ہیں۔ لیکن قرآن بالعموم اس اصطلاحی فرق کو نظر انداز کرکے صدقہ اور زکوٰۃ دونوں کو ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

۳۰۴ اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تمہاری خیرات کا حاجتمند نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود بردبار ہے اس لیے اسے پسند بھی وہی لوگ ہیں جن کے اندر بردباری کی صفت ہو۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اُس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔[۱] اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی، اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔[۲] ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔[۳] بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دو گنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے

(بقیہ صفحہ سابق) جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمہارے قصوروں کے باوجود تمہیں بار بار بخشتا ہے وہ ایسے لوگوں کو کیوں کر پسند کر سکتا ہے جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں تو احسان جتا جتا کر اس کی عزتِ نفس کو خاک میں ملا دیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرفِ ہمکلامی اور نظرِ عنایت سے محروم رکھے گا جو اپنے عطیہ پر احسان جتاتا ہو۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اُس کی ریاکاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کی خدا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے، اللہ سے نہ اس کو اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیے جائیں گے۔

[۲] اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے، اور چٹان سے مراد اُس نیت اور اُس جذبہ کی خرابی ہے جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے اور مٹی کی ہلکی تہہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضاء تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور کھیتی نشو و نما پائے لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اوپر ہی اوپر ہو اور اس اوپری تہہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو تو بارش مفید ہونے کے بجائے الٹی مضر ہو گی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشو و نما دینے کی قوت رکھتی ہے مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابرِ کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاعِ مال ہے اور کچھ نہیں۔

[۳] یہاں "کافر" کا لفظ ناشکرے اور منکرِ نعمت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو (باقی صفحہ آئندہ پر)

کافی ہو جائے[۱]۔ تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو، نہروں سے سیراب کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اُس وقت ایک تیز گرم بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں[۲]؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے شاید کہ تم غور و فکر کرو۔ ع ۳۶

اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمھارے لیے نکالا ہے اُس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے تو تم ہرگز اُسے لینا گوارا نہ کروگے الا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمھیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے[۳]۔

(بقیہ صفحہ سابق) اس کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے بجائے خلق کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے، یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے تو اس کے ساتھ اذیت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشکرا اور اپنے خدا کا احسان فراموش ہے۔ اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] "زور کی بارش" سے مراد وہ خیرات ہے جو انتہائی جذبۂ خیر اور کمال درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کی جائے۔ اور ہلکی پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے جس کے اندر جذبۂ خیر کی شدت نہ ہو۔

[۲] یعنی اگر تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھاری عمر بھر کی کمائی ایک ایسے نازک موقع پر تباہ ہو جائے جبکہ تم اُس سے فائدہ اُٹھانے کے سب سے زیادہ محتاج ہو اور از سرِ نو کمائی کرنے کا موقع بھی باقی نہ ہو، تو کیا تم یہ پسند کروگے کہ دنیا میں مدۃ العمر کام کرنے کے بعد جب آخرت کی زندگی میں تم قدم رکھو تو وہاں یکایک تمھیں معلوم ہو کہ تمھارا پورا کارنامۂ حیات یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا، جو کچھ تم نے دنیا کے لیے کمایا تھا وہ دنیا ہی میں رہ گیا، آخرت کے لیے کچھ کما کر لائے ہی نہیں کہ یہاں اس کے پھل کھا سکو۔ وہاں تمھیں اس کا کوئی موقع نہ ملے گا کہ از سرِ نو آخرت کے لیے کمائی کرو۔ آخرت کے لیے کام کرنے کا جو کچھ بھی موقع ہے اسی دنیا میں ہے۔ یہاں اگر تم آخرت کی فکر کیے بغیر ساری عمر دنیا ہی کی دھن میں لگے رہے اور اپنی تمام قوتیں اور کوششیں دنیوی فائدے تلاش کرنے ہی میں کھپا دیں، تو آفتابِ زندگی کے غروب ہونے پر تمھاری حالت بعینہٖ اُس بڈھے کی طرح حسرت ناک ہوگی جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ تھا اور وہ باغ عین عالمِ پیری میں اُس وقت جل گیا جبکہ وہ خود نئے سرے سے باغ لگا سکتا ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے، اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے[۱] اور جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔

تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو اللہ کو اس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں[۲]۔ اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے[۳]۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں[۴]۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہر حال

(بقیہ صفحہ سابق) اور نہ اس کی اولاد ہی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے۔

[۳] ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہو وہ برے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر آن بخشش وعطا کے دریا بہا رہا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر، کم حوصلہ اور پست اخلاق لوگوں سے محبت کرے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوتِ فیصلہ ہے۔ یہاں اس ارشاد سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا بلکہ اُس راہِ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر مریدوں کی نگاہ میں بڑی ہشیاری اور عقلمندی یہ ہے کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر ہی میں لگا رہے۔ لیکن جن لوگوں نے اللہ سے بصیرت کا نور پایا ہے ان کی نظر میں یہ عین بے وقوفی ہے، اور حکمت و دانائی ان کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اس سے اپنی متوسط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر بھلائی کے کاموں میں خرچ کرے۔ پہلا شخص ممکن ہے کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں دوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو، لیکن انسان کے لیے یہ دنیا کی زندگی پوری زندگی نہیں بلکہ اصل زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جزء ہے۔ اس چھوٹے سے جزء کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بدحالی مول لیتا ہے وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ اور عقلمند دراصل وہ ہے جس نے اس مختصر زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر تھوڑے سرمایہ ہی سے اُس ہمیشگی کی زندگی میں اپنی خوشحالی کا بندوبست کر لیا۔

[۲] خرچ خواہ راہِ خدا میں کیا ہو یا راہِ شیطان میں، اور نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیر اللہ کے لیے، دونوں صورتوں میں تمہاری نیت اور تمہارے فعل سے اللہ خوب واقف ہے۔ جنھوں نے اُس کے لیے خرچ کیا ہوگا اور اس کی خاطر (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس کی خبر ہے۔

لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔[۵۱] اور خیرات کی قسم سے جو خرچ تم کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو، تو جو کچھ تم بھلائی کی راہ میں خرچ کروگے اس کا پورا پورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوشحال ہیں، تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔[۵۲] ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کروگے وہ اللہ سے پوشیدہ

(بقیہ صفحہ سابق) نذر مانی ہوگی وہ اس کا اجر پائیں گے، اور جن ظالموں نے شیطانی راہوں میں خرچ کیا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے نذریں مانی ہوں گی ان کو خدا کی سزا سے بچانے کے لیے کوئی مددگار نہ ملے گا۔

نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کرلے جو اس کے ذمہ فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو اور اللہ سے مانگی گئی ہو اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہو تو ایسی نذر اللہ کی طاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اور اگر یہ صورت نہ ہو تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔

[۵۰] جو صدقہ فرض ہو اس کو علانیہ دینا افضل ہے اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو اس کا اخفا زیادہ بہتر ہے۔ یہی اصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ فرائض کا علانیہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے اور نوافل کو چھپا کر کرنا اولیٰ ہے۔

[۵۱] یعنی چھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس و اخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے اوصاف حمیدہ خوب نشوونما پاتے ہیں، اس کی بری صفات رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں، اور یہی چیز اللہ کے ہاں اس کو اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتے بھی ہیں انھیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] ابتدا میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور عام غیر مسلم اہل حاجت کی مدد کرنے میں تامل کرتے تھے (باقی صفحہ آئندہ پر)

نہ رہے گا۔ ع۷

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سود[55] کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا[56] ہو، اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "تجارت

(بقیہ صفحہ سابق) اور ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں ان کی یہ غلط فہمی دور کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اُتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے، اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ رہا دنیوی مال و متاع سے ان کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تامل نہ کرو کہ انھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کرو گے اس کا اجر اللہ تمھیں دے گا۔

۵۴ اس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی معاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس قسم کے رضاکاروں کا ایک مستقل گروہ تھا جو تاریخ میں اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آگئے تھے، ہمہ وقت حضورؐ کے ساتھ رہتے تھے، ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے، حضورؐ جس مہم پر چاہتے انھیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینہ سے باہر کوئی کام نہ ہوتا اس وقت یہ مدینہ ہی میں رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور دوسرے بندگانِ خدا کو اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے کارکن تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۵ اصل میں لفظ ربوٰ استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی لغت میں زیادتی اور اضافہ کے ہیں۔ اصطلاحاً اہل عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا ہے۔ اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنھیں اہل عرب "ربوٰ" کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے وہ یہ تھیں کہ مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا، اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ یا مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی۔ یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع

(باقی صفحہ آئندہ پر)

بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے"، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔[۲] لہٰذا جس شخص کو

(بقیہ صفحہ سابق) اضافہ کے ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ اسی نوعیت کے معاملات کا حکم یہاں بیان کیا جارہا ہے۔

[۱] اہل عرب دیوانے اور پاگل آدمی کو "مجنون" (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہوگیا ہے تو یوں کہتے کہ اسے جن لگ گیا ہے۔ اسی محاورہ کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سود خوار کو اس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہوگیا ہو۔ یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے اسی طرح سود خوار بھی روپے کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سود خواری سے کس کس طرح انسانی محبت، اخوت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں، اجتماعی فلاح و بہبود پر کس قدر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے، اور کتنے لوگوں کی بدحالی سے وہ اپنی خوشحالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اس دنیا میں ہے، اور چونکہ آخرت میں انسان اُسی حالت میں اٹھایا جائے گا جس حالت پر اس نے دنیا میں جان دی ہے، اس لیے سود خوار آدمی قیامت کے روز ایک باولے، مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اٹھے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی ان کے نظریہ کی خرابی یہ ہے کہ تجارت میں اصل لاگت پر جو منافع لیا جاتا ہے اس کی نوعیت اور سود کی نوعیت کا فرق وہ نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت کا منافع جائز ہے تو سود کیوں ناجائز ہو۔

[۲] تجارت اور سود کا اصولی فرق جس کی بنا پر دونوں کی معاشی اور اخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے:

(۱) تجارت میں بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ مشتری اُس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے، اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ مہلت اس کے لیے قطعی نافع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی مہلت میں جس طرح اُس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہر حال وہ جو کچھ لیتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

اُس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو، بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدہ کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائل معیشت، حتیٰ کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایہ میں اصل شے جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صرف نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہ کرایہ دار کو واپس دیدی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اُس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافہ کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریکِ غالب بن جاتا ہے۔ اُس کی حیثیت اصطلاحی "شریک" کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔

ان وجوہ سے تجارت کی معاشی حیثیت اور سود کی معاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے اور ہمدردی و امداد باہمی کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر سود معاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوعِ انسانی کے لیے تباہ کن ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ اس نے کھا لیا اسے اللہ معاف کر دے گا بلکہ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ "جو کھا چکا سو کھا چکا" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کھا چکا اسے معاف کر دیا گیا بلکہ اس سے محض قانونی رعایت مراد ہے۔ یعنی جو سود پہلے کھایا جا چکا ہے اسے واپس دینے کا قانوناً (باقی اگلے صفحہ پر)

کرے وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے۔[۵۱]
اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔[۵۲] ہاں جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور

(بقیہ صفحہ سابق) مطالبہ نہیں کیا جائیگا، کیونکہ اگر اس کا مطالبہ کیا جائے تو مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے جو کہیں جاکر ختم نہ ہو۔ مگر اخلاقی حیثیت سے اس مال کی نجاست بدستور باقی رہے گی جو کسی شخص نے سودی کاروبار سے سمیٹا ہو۔ اگر وہ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والا ہوگا اور اس کا معاشی و اخلاقی نقطۂ نظر واقعی اسلام قبول کرنے سے تبدیل ہو چکا ہوگا تو وہ خود اپنی اس دولت کو جو حرام ذرائع سے آئی تھی اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پرہیز کرے گا اور کوشش کرے گا کہ جہاں تک ان حقداروں کا پتہ چلایا جاسکتا ہے جن کا مال اس کے پاس ہے، اس حد تک ان کا حق انھیں واپس کر دیا جائے، اور جس حصۂ مال کے مستحقین کی تحقیق نہ ہو سکے اسے اجتماعی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ یہی عمل اسے خدا کی سزا سے بچا سکے گا۔ رہا وہ شخص جو پہلے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اٹھاتا رہے، تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پا کر رہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱؎ یعنی محدود نگاہ رکھنے والے لوگ جو کچھ دیکھتے ہیں، حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے نزدیک سود سے دولت بڑھتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہے۔ لیکن درحقیقت سود دولت کو گھٹاتا ہے اور صدقات سے دولت کو نشو ونما حاصل ہوتا ہے۔ سود کا خاصہ یہ ہے کہ پوری سوسائٹی کی دولت سمٹ سمٹ کر ایک محدود اور محدود تر طبقہ میں اکٹھی ہوتی چلی جائے اور سوسائٹی کا کثیر اور کثیر تر طبقہ کم سے کم وسائل زندگی سے بھی محروم ہوتا جائے۔ یہ چیز بالآخر پوری سوسائٹی کے لیے تباہی کی موجب بن جاتی ہے اور اس تباہی سے وہ طبقہ بھی نہیں بچ سکتا جن کے پاس سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے برعکس اس کے صدقات دولت کو عام باشندوں میں پھیلاتے ہیں، اور اس سے اجتماعی دولت بڑھتی ہے۔ اگر فی الواقع محض خدا کی خوشنودی کے لیے، ریا اور نام ونمود اور خود غرضی سے پاک ہو کر، اجتماعی فلاح و بہبود اور انفرادی اعانت و ہمدردی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کی عادت لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ چیز عام خوشحالی کی موجب بن جاتی ہے۔ پھر چونکہ آخرت کی زندگی اسی دنیوی زندگی کے اعمال کا اخلاقی نتیجہ ہے اس لیے سود کا زوال اور صدقات کا نشو ونما وہاں اور زیادہ نمایاں صورت میں ہوگا۔

۵۲؎ ظاہر ہے کہ سود پر روپیہ وہی شخص چلا سکتا ہے جس کو دولت کی تقسیم میں اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ حصہ ملا ہو۔ یہ ضرورت سے زیادہ حصہ جو ایک شخص کو ملتا ہے، قرآن کے نقطۂ نظر سے دراصل یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ کے فضل کا صحیح شکر یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے بندے پر فضل فرمایا ہے اسی طرح وہ بندہ بھی اس کے دوسرے بندوں پر فضل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس خدا کے فضل کو اس غرض کے لیے استعمال کرتا ہے کہ جو بندے دولت کی تقسیم میں اپنی ضرورت سے کم حصہ پائے ہوئے ہیں ان کے قلیل حصہ میں سے بھی اپنی دولت کے زور پر ایک ایک جزء اپنی طرف کھینچ لے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔[۱]

اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔[۲] اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے تم حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ تمہارا قرض دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اُسے مہلت دو، اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اُس دن کی رسوائی و مصیبت سے بچو جبکہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہوگا۔ ع۳۸

(بقیہ صفحہ سابق) وہ حقیقت میں ناشکرا بھی ہے اور ظالم، جفاکار، بدعمل بھی۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ بار بار دو قسم کے کرداروں کو بالمقابل پیش کر رہا ہے۔ ایک کردار خود غرض، زر پرست، شائیلاک قسم کے انسان کا ہے جو خدا اور خلق دونوں کے حقوق سے بے پروا ہو کر روپیہ گننے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے اس کو بڑھانے اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں منہمک ہو۔ دوسرا کردار ایک خدا پرست، فیاض اور ہمدرد انسان کا کردار ہے جو خدا اور خلقِ خدا دونوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہو، اپنی قوتِ بازو سے کما کر خود کھائے اور دوسرے بندگانِ خدا کو کھلائے اور دل کھول کر نیک کاموں میں خرچ کرے۔ پہلی قسم کا کردار خدا کو سخت ناپسند ہے، دنیا میں اس کردار پر کوئی صالح سوسائٹی نہیں بن سکتی اور آخرت میں ایسے کردار کے لیے غم و اندوہ اور کلفت و مصیبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کو دوسری قسم کا کردار پسند ہے، اسی سے دنیا میں صالح سوسائٹی بنتی ہے اور وہی آخرت میں انسان کے لیے موجبِ فلاح ہے۔

سلہ یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اس سلسلۂ کلام میں داخل کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگرچہ سود ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے نزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جرم بن گیا۔ چنانچہ جو قبیلے سود کھاتے تھے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کے ذریعہ سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ اسی طرح (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو، جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو[1] تو اسے لکھ لیا کرو۔[2] فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو اُسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا) اور اُسے اللہ، اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو، یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے مردوں میں سے[3] دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔[4] گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے

(بقیہ صفحہ سابق) نجران کے عیسائیوں سے جب معاہدۂ صلح ہوا تو اس میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمہارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ کی بنا پر ابن عباس، حسن بصری، ابن سیرین اور ربیع بن انس کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دارالاسلام میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے فقہاء کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے جب تک وہ سود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے اُسے چھوڑا نہ جائے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱؎ اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ قرض کے معاملہ میں مدت کا تعین ہونا چاہیے۔

۲؎ عموماً دوستوں اور عزیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو معیوب، اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے، لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی قرار دادوں کو تحریر میں لانا چاہیے اور اس پر شہادت ثبت کرا لینی چاہیے تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں مگر ان کی فریاد سنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بدخلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ اور تیسرا وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

۳؎ ان الفاظ سے بعض فقہاء نے یہ سمجھا ہے کہ گواہ مسلمان ہی ہونے چاہییں لیکن امام ابو حنیفہ غیر مسلم کی شہادت کو بھی جائز رکھتے ہیں۔

۴؎ مطلب یہ ہے کہ ہر کس و ناکس گواہ ہونے کے لیے موزوں نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو گواہ (باقی اگلے صفحہ پر)

تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا میعاد کے تعین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمھارے لیے زیادہ مبنی بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور تمھارے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں،[۵۰] مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے[۵۱]۔ ایسا کرو گے تو نافرمانی کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو، وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو[۵۲]۔

اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ، اپنے رب سے ڈرے۔

(بقیہ صفحہ سابق) کیا جائے جو اپنے اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۰ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روزمرہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملہ بیع کا تحریر میں آجانا بہتر ہے، جیسا کہ آج کل کیش میمو لکھنے کا طریقہ رائج ہے، تاہم ایسا کرنا لازم نہیں۔

۵۱ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ کوئی فریق کاتب یا گواہ کو اس بنا پر نہ ستائے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف صحیح شہادت دیتا ہے۔

۵۲ یہ مطلب نہیں ہے کہ رہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہو سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت چونکہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملۂ رہن کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو صرف اسی صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب محض دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے لے۔ لیکن قرآن مجید چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بات بلند اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند (باقی اگلے صفحہ پر)

اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ[۱]، جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہوتا ہے، اور اللہ تمھارے
۹ع۳ اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

آسمانوں[۲] اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے[۳]۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو خواہ چھپاؤ، اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے لے گا[۴]، پھر اُسے اختیار ہے جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۵]۔

رسول اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے، اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے

(بقیہ صفحہ سابق) آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضہ میں شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ البتہ دودھ دینے والے جانور کا دودھ استعمال کر سکتا ہے اور سواری کے جانور پر وہ سوار بھی ہو سکتا ہے مگر یہ دراصل اُس چارے کا معاوضہ ہے جو وہ اس جانور کو کھلاتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] شہادت دینے سے گریز کرنا، یا شہادت میں صحیح واقعات کے اظہار سے پرہیز کرنا، دونوں پر "شہادت چھپانے" کا اطلاق ہوتا ہے۔

[۲] یہ خاتمہ کلام ہے، اس لیے جس طرح سورۃ کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا اسی طرح سورۃ کو ختم کرتے ہوئے بھی اُن تمام اصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دین اسلام کی اساس قائم ہے۔

[۳] یہ دین کی اولین بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مالک زمین و آسمان ہونا اور اُن تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں، اللہ ہی کی ملک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے کوئی دوسرا طرزِ عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دے۔

[۴] اس فقرے میں دو باتیں اور ارشاد ہوئیں۔ ایک یہ کہ ہر انسان فرداً فرداً اللہ کے سامنے ذمہ دار (باقی اگلے صفحہ پر)

رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی، مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے"۔[۱]

اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔[۲] ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔[۳]

(بقیہ صفحہ سابق) جواب دہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ پادشاہ زمین و آسمان جس کے سامنے آدمی جواب دہ ہے، غیب و شہادت کا علم رکھتا ہے حتی کہ دلوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۵۸ یہ اللہ کے اختیار مطلق کا بیان ہے۔ اس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبور ہو، بلکہ وہ مالک مختار ہے، سزا دینے اور معاف کرنے کے کلّی اختیارات اس کو حاصل ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ اس آیت میں تفصیلات سے قطع نظر کر کے اسلام کے عقائد اور اسلامی طرز عمل کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ اللہ کو، اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو ماننا، اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے)، اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخر کار ہمیں اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے، یہ پانچ اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ اور مسلمان کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے اُسے بسر و چشم قبول کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اپنے حسن عمل پر غرّہ نہ کرے بلکہ اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کرتا رہے۔

۲؎ یعنی اللہ کے ہاں انسان کی ذمہ داری اس کی مقدرت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ اس سے باز پرس کرے کہ تو نے فلاں کام کیوں نہ کیا، یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اُس کی قدرت سے باہر ہو اور اللہ اس پر مواخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اپنی مقدرت کا فیصلہ کرنے والا انسان خود نہیں ہے، اس کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا تھا اور کس چیز کی نہ رکھتا تھا۔

۳؎ یہاں اللہ کے قانون مجازات کا ایک دوسرا قاعدہ کلیہ ارشاد ہوا ہے۔ ہر آدمی انعام اسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دوسرا انعام پائے۔ اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے قصور میں دوسرا پکڑا جائے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کام کے اثرات (باقی اگلے صفحہ پر)

(ایمان لانے والو تم یوں دعا کیا کرو) مالک! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں اُن پر گرفت نہ کر۔ آقا! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے(۱)۔ پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں وہ ہم پر نہ رکھ(۲)، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگذر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے پس کافروں کی جماعت کے مقابلہ میں ہماری مدد کر(۳)۔

(بقیۂ سابق) چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامہ میں لکھے جائیں، اور ایک دوسرے شخص نے کسی بُرائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالمِ اول کے حساب میں درج ہوتا رہے۔ لیکن یہ اچھا یا بُرا جو کچھ بھی پھل ہوگا اسی کی سعی اور اسی کے کسب کا نتیجہ ہوگا۔ بہرحال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس بُرائی میں آدمی کی نیت اور سعی و عمل کا کوئی حصہ نہ ہو اس کی جزا یا سزا اسے مل جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) (۱) یعنی ہمارے پیش روؤں کو تیری راہ میں جو آزمائشیں پیش آئیں، جن زبردست ابتلاؤں میں سے وہ گذرے جن مشکلات سے انھیں سابقہ پڑا، اُن سے ہمیں بچا۔ اگرچہ اللہ کی سنت یہی رہی ہے کہ جس نے بھی حق و صداقت کی پیروی کا عزم کیا ہے اسے سخت آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، اور جب آزمائشیں پیش آئیں تو مومن کا کام یہی ہے کہ پورے استقلال سے ان کا مقابلہ کرے، لیکن بہرحال مومن کو اللہ سے دعا یہی کرنی چاہیے کہ وہ حق پرستی کی راہ کو آسان کر دے۔

(۲) یعنی مشکلات کا اُتنا ہی بار ہم پر ڈال جسے ہم سہار لے جائیں، آزمائشیں بس اتنی ہی بھیج کہ ان میں ہم پورے اُتر جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری قوتِ برداشت سے بڑھ کر سختیاں ہم پر نازل ہوں اور ہمارے قدم راہِ حق سے ڈگمگا جائیں۔

(۳) اس دعا کی پوری روح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں جب کہ مکہ میں کفر و اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکہ ہی میں نہیں بلکہ سرزمینِ عرب میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندۂ خدا نے دینِ حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی زمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ اِن حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا ڈھنگ بتائے تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دعا اُس وقت مسلمانوں کیلئے غیر معمولی تسکینِ قلب کی موجب ہوئی۔ علاوہ بریں اس دعا میں ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رُخ پر نہ بہنے دیں بلکہ انھیں اِس دعا کے سانچے میں ڈھال لیں۔ ایک طرف اُن روح فرسا مظالم کو دیکھیے جو محض حق پرستی کے جرم میں اِن لوگوں پر توڑے جا رہے تھے، اور دوسری طرف اِس دعا کو دیکھیے جس میں دشمنوں کے خلاف کسی تلخی کا شائبہ تک نہیں، ایک طرف اُن جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کو دیکھیے جن میں یہ لوگ مبتلا تھے، اور دوسری طرف اِس دعا کو دیکھیے جس میں کسی دنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ نشان تک نہیں ہے۔ ایک طرف ان حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھیے اور دوسری طرف اُن بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھیے جن سے یہ دعا لبریز ہے۔ اِس تقابل ہی سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت اہلِ ایمان کو کس طرز کی اخلاقی و روحانی تربیت دی جا رہی تھی۔

جماعتِ اسلامی کی حقیقت اور ہماری کام کی نوعیت

بعض شبہات کا جواب

(از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی)

("جماعتِ اسلامی" کے متعلق ایک صاحبِ علم بزرگ نے اپنے ایک طویل خط میں کچھ خیالات ظاہر فرمائے تھے، اس کا جو جواب دیا گیا وہ بھی طویل ہو گیا۔ اس جواب کا ایک حصہ جو عمومی حیثیت رکھتا ہے اور ایسے سوالات کے جواب میں ہے جو بہت سے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں اور جس سے جماعت کے متعلق انشاء اللہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں ہدیۂ ناظرین کرام کیا جاتا۔ امید ہے کہ اس سے "جماعتِ اسلامی" کی اصلی حیثیت کے سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

چونکہ اہلِ نظر اس جواب ہی سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ سوال کیا تھا؟ اس لیے "اس سوال نامہ" کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی سلام مسنون! مزاجِ گرامی؟

. . . .

میرے خیال میں "جماعتِ اسلامی" پر غور کرتے وقت ہمارے ان بنیادی تصورات کو ضرور سامنے رکھ لینا چاہیے جو تاسیس و تشکیلِ جماعت کے لیے اصل عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو ہمارے اس اقدام کے لیے بمنزلہ بنیادی محرکات کے ہیں ـــــ وھی ھٰذہ:-

(الف) اسلام اپنے ماننے والوں سے جس طریقِ زندگی اور اقامتِ دین و اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جس جدوجہد کا

مطالبہ کرتا ہے وہ پورا نظام "طولِ اَمَد"[۱] اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے درہم برہم ہوچکا ہے اور بظاہر اسباب اسی وجہ سے عملی دنیا میں "اسلام" "جاہلیت" سے مغلوب ہو رہا ہے۔ اب اس کے کچھ متفرق اجزاء اور منتشر حصے ضرور باقی ہیں، کچھ مسجدوں میں، کچھ مدرسوں میں، کچھ خانقاہوں میں اور کچھ بعض خوش نصیب دینداروں کی انفرادی اور گھریلو زندگی میں بھی، لیکن وہ پوری چیز یقیناً موجود نہیں رہی جو اسلام کا مقصد اور مقتضیٰ تھا اور ایمانداروں کو جس پر قائم اور جس کے لیے سرگرمِ عمل ہونا چاہیے تھا۔

(ب) اب کچھ لوگ از خود یا کسی کی تذکیر سے اپنی اور عام امتِ مسلمہ کی اس تقصیر کو محسوس کرکے اپنا فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے اپنی کوششوں کو منظم اور مجتمع کرکے زیادہ موثر اور طاقتور بنانے کے لیے، نیز اسلام تنظم اور اجتماعیت کی جو ہدایت کرتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے کو ایک جماعت بنا لینا ضروری سمجھا اور اسلامی تعلیم کے مطابق اپنا ایک امیر بھی منتخب کر لیا جس کے زیرِ قیادت وہ اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں لیکن اس جماعت کی حیثیت بس ایک حزب اور پارٹی کی ہے جو ایک مقصدِ خیر اور اس کے طریقِ کار پر متفق ہوگئی ہے۔ نہ یہ کل "امتِ مسلمہ" ہے اور نہ حق وایمان اور خدمتِ دین کو اپنا اجارہ اور اپنے میں منحصر سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اس کو یقین ہے کہ اس کے دائرے سے باہر بھی حق وایمان کے حامل اور دین کے سچے خادم موجود ہیں۔

(ج) "ان لوگوں" کے سامنے اس وقت دو کام ہیں۔ ایک اپنی اصلاح اور اپنی زندگی کا تزکیہ۔ اور دوسرے اور لوگوں کو بھی یہ پیغام پہنچانا اور ان کو بھی اس فریضہ کی طرف متوجہ کرنا، اور اس طرح اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے مقصد کے لیے طاقت بھی مہیا کرنا۔

(د) اب جو "دوسرے لوگ" ہیں تو ابتدائی تقسیم کے لحاظ سے وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک "مسلمان"۔ اور دوسرے "غیر مسلم" (بجمیع اصنافہم)۔ جو مسلمان کہلانے والے ہیں ان میں قطعاً و یقیناً مندرجہ ذیل قسموں کے

---

[۱] یعنی بعد عہد نبوت۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں اہلِ کتاب کی گمراہی کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا "فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ"۔

عناصر موجود ہیں اور شواذ کے درجہ میں نہیں، بلکہ ہر عنصر کے لاکھوں افراد آپ کو ہماری اس "اسلامی دنیا" میں مل سکتے ہیں :-

(۱) حقیقی ایمان و صلاح رکھنے والے، جو علماً و اعتقاداً بھی مومن ہیں اور عملاً و فعلاً بھی (جیسا کہ جاہلیت سے مغلوب، اِس فاسد ماحول میں کوئی آدمی "مومنِ صالح" ہو سکتا ہے)

(۲) اعتقاداً مومن لیکن عملی حالت نہایت ابتر، فسق و فجور کے درجہ کو پہنچی ہوئی (علی اختلاف مراتبہم)

(۳) "عبادات" اور "اذکار و اشغال" تک میں انہماک رکھنے والے رہبانیت پسند صوفی منش جن میں سے اکثر سخت درجہ گمراہانہ عقائد میں مبتلا ہوتے ہیں، مثلاً ہمارے زمانہ کے بہت سے "نیک نیت صوفی" اور ان کے معتقدین جن میں قبر پرستی اور پیر پرستی جیسے موجباتِ شرک بھی موجود ہیں۔

(۴) مغربی الحاد کے برباد کیے ہوئے ملاحدہ (علی اختلاف اصنافہم و مراتبہم)

(۵) خوجے، بوہرے اور اسمٰعیلی اور اثنا عشری شیعہ اور قادیانی جیسے فرق بالکل جنھوں نے اپنے کو امت کے اندر رکھتے ہوئے ایک مستقل مذہبی ملت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

(۶) وہ عوام مسلمان جو اتنا جانتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، اللہ ایک ہے اور اس کا رسول برحق، قیامت اور جزا سزا پر بھی ان کا ایمان ہے، نماز روزہ کر بھی لیتے ہیں اور نہیں بھی کرتے، غرض ان کا ایمان بہت مجمل ہے اور عمل بھی بہت ناقص، اسی کے ساتھ وہ بہت سی خرافات و توہمات کو دین و مذہب بھی سمجھے ہوئے ہیں۔ غرض فی الجملہ مسلمان ہونے کے باوجود وہ دین کے حقیقی تصور سے ناآشنا ہیں، اور اس کے خاص تقاضوں اور مطالبوں سے بالکل بے خبر، ایسے کہ اگر آپ ان سے کہیں کہ اسلام میں "حاکمیت" صرف اللہ ہی کے لیے ہے، اور "اقتدار اعلیٰ" بس اللہ کا ہونا چاہیے اور جو اشخاص یا جو جماعتیں قانونِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر آج اللہ کی زمین پر حکمرانی کر رہی ہیں اُن کی حیثیت "طواغیت" اور باغیانِ خدا کی ہے، اور ان کی اس حاکمانہ حیثیت کو قبول کر لینا اور اس پر راضی رہنا بلکہ اس کے استیصال کی

فکر سے غافل رہنا بھی "اسلام" کی نظر میں انسان کی معصیت ہے، تو وہ حیرت سے آپ کا منہ تکیں گے۔
—— (بلکہ یہ حال تو بہت سے پڑھے لکھے "دینداروں" کا بھی آپ پائیں گے اور میں نے پایا ہے)

(۷) وہ عوام جو "ضروریاتِ دین" تک سے ناواقف ہیں، وہ بس اتنا جانتے ہیں کہ جیسے ہندو ہندو ہیں ویسے ہم مسلمان ہیں اور "مسلمان" وہ ہے جو مسلمان ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ کلمۂ اسلام کے مفہوم تک سے ناآشنا ہیں، بلکہ بہت سے اُن میں سے اس کے تلفظ سے بھی عاجز ہیں۔

غرض امتِ مسلمہ میں یہ تمام عناصر موجود ہیں۔ میرے اندازہ میں باعتبارِ تعداد ان میں سب سے کم پہلا عنصر اور سب سے زیادہ آخر اور ماقبلِ آخر۔

(ھ) اب جو جماعت مندرجہ صدر مقاصد کو لے کر کھڑی ہوئی ہے، یا جو لوگ ان ارادوں کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ان تمام مسلمان کہلانے والوں کو آپ کی اصطلاح میں "امتِ نبی" مانتے ہوئے اپنے "نصب العین" کے لیے جدوجہد کی دعوت دیں ——
(جیسا کہ مثلاً فلاں فلاں[1] اسلامی جماعتوں کا طرزِ عمل ہے کہ اپنے مقاصد اور "نصب العین" کو سامنے رکھ کر وہ ہر مسلمان کو دعوت دیتے ہیں اور سب کی بھرتی کرتے ہیں۔ انھیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ اُن کی اعتقادی یا عملی حالت کیا ہے اور اُن کو "اصولِ ایمان" اور "ضروریاتِ دین" تک کا بھی شعور ہے یا نہیں۔ یعنی ان کی دعوت "مسلمان قوم" کو ہے) تو ایک طریقہ تو یہ ہے کہ "اعلائے کلمۃ الحق" اور "اقامتِ دین" کو نصب العین بنانے والی، اور اس راہ میں جو فریضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان پر عائد ہوتا ہے اس کو ادا کرنے ہی کی نیت سے کھڑی ہونے والی یہ جماعت بھی اسی طریقہ پر پوری "مسلمان قوم" کو بلا کسی امتیاز کے اس مقصد کے لیے اپنے ساتھ جدوجہد کرنے کی دعوت دے، اور اسی ٹائپ کی ایک اور جماعت بنا کر کام شروع کر دے۔ نہ وہ یہ شرط لگائے کہ اس کے رفقاء اور

---

[1] یہاں اصل خط میں مسلمانوں کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کے نام تھے۔

سپاہیوں میں "ایمان" اور اس کا شعور ہونا چاہیے اور نہ یہ کہ ان کی عملی زندگی اور ان کا کیرکٹر کسی درجے میں تو اسلامی ہو۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس پورے اجتماع میں سے ایسے لوگوں کو تلاش کیا جائے جو دین کا ضروری علم و شعور رکھتے ہوں، ان کی زندگی کو اس اعلیٰ اور مقدس مقصد سے فی الجملہ مناسبت ہو اور اس مشن کے لیے جس طرح اور جس انتظام کے ساتھ آگے بڑھنا ہو اس کے نباہنے کی فی الجملہ صلاحیت ان میں موجود ہو ۔۔۔ اور جن افراد میں یہ باتیں بھی موجود نہیں ہیں اُن میں تبلیغ و تذکیر کے ذریعہ پہلے یہ باتیں پیدا کی جائیں، پھر ان کو اس راہ میں جدوجہد کرنے کے لیے دعوت دی جائے اور اس تبلیغ اور دعوت الی اللہ کا دائرہ صرف "مسلمانوں" اور کلمہ گویوں ہی تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ جو غیر مسلم ہیں، اُن تک بھی اللہ کا پیغام پہنچایا جائے اور پھر اُن میں سے جو خوش بخت اس کو قبول کر لیں اُن کو بھی اس نصب العین کے لیے حرکت کرنے اور اس راہ پر چلنے کی دعوت دی جائے۔ پھر جتنے لوگ اس کوشش کے نتیجہ میں اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ ہوں وہ ایک طرف تو اپنی زندگی کو ایک مومن کی سی زندگی بنانے کی کوشش کریں اور دوسری طرف دوسروں کو بھی دعوت دینے اور اس طرح اس تحریک کو آگے بڑھانے میں لگ جائیں۔

(۹) ہم لوگوں نے اسی آخر الذکر طریقہ کو صحیح سمجھا ہے۔ اور میرے نزدیک بس یہی ہے حاصل ہمارے عزائم، ہمارے اس وقت کے کام اور ہمارے فرائض کا ۔۔۔ جماعت کے دستور وغیرہ میں اس کے سوا کچھ نہیں، جو کچھ ہے بس اسی کی تفصیلات اور جزئی تفریعات یا اس کے لوازم اور مقتضیات ہیں ۔۔۔ اس "جماعت" کی تاسیس اور تشکیل کے ذریعہ ملت سے الگ اپنا کوئی "جماعتی تشخص" قائم کرنا چاہتے ہیں اور نہ خدانخواستہ کسی "فرقہ وارانہ ہیکل" کی تعمیر ہمارا مقصد ہے اور نہ ہم اپنے کو دوسروں سے اچھا مسلمان ہی سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس قسم کی گمراہیوں سے ہم ہزار بار خدا کی پناہ چاہتے ہیں "جماعت" کی تاسیس کے

پہلے دن بھی اس بارہ میں ہم نے اپنے ذہنوں کو صاف کر لیا تھا اور بعد میں بھی اس خطرہ سے برابر ہشیار رہے ہیں ــــ "جماعتِ اسلامی" کے پہلے اجتماع کی روداد ہی کے ملاحظہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ ایک "فرقہ" بننا نہیں چاہتے بلکہ اس خطرہ سے پوری طرح ہشیار بھی ہیں (ملاحظہ ہو روداد اجتماع ص۲۹ و ص۳۰ جہاں مولانا مودودی نے خود ہی جماعت کو اس خطرہ سے ہشیار کیا ہے اور خدا نکردہ رفقاءِ جماعت کو اس بارہ میں جو غلط فہمی ہو سکتی تھی اور جس راستہ سے وہ آ سکتی تھی اُس تک کا انسداد کر دیا ہے اور سخت ترین تاکید کی ہے کہ جماعت کے ارکان کو ایسے تمام طریقوں سے پرہیز کرنا چاہیے جو ان کو مسلمانوں میں "ایک فرقہ" بنانے والے ہوں الخ ص۳۰)

بہرحال اس معاملہ میں ہمارا ذہن، اور ہمارا معاملہ بھی الحمد للہ بالکل صاف ہے اور ہم غالباً دوسروں سے زیادہ اس کی اہمیت اور خطرناکی کو سمجھتے ہیں۔

اس کے باوجود ہمارے بعض خاص کر مفرما ناقدین اور معترضین نے اپنے اس خطرہ کو ظاہر کیا ہے یا دوسروں کو اس شبہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ "جماعتِ اسلامی" گویا ایک نیا مذہبی فرقہ پیدا ہو رہا ہے جس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ گویا اب تک ہم "صاحبِ ایمان" نہیں تھے، اور اب اس "جماعت" میں شامل ہو کر "مومن" بن رہے ہیں، اور اسی طرح جو دوسرے عام مسلمان ہیں وہ "مومن" نہیں ہیں اور اب ہم کو انھیں "دعوتِ ایمان" دینی اور "مسلمان" کرنا ہے ــــ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس قسم کے غالیانہ تخیلات اور وساوس سے شاید ان معترضین سے بھی زیادہ بیزار اور پُرحذر ہیں۔

خود میری اپنی سرگذشت یہ ہے کہ جس دن سے ہوش سنبھالا اور دینی شعور حاصل کیا ہے الحمد للہ ایمان کی نعمت اُسی دن سے ساتھ ہے، اور خدمتِ دین اور دعوت الی اللہ کا کام بھی جو بن پڑا انفرادی طور پر اپنی سمجھ اور فکر کے مطابق کرتا رہا۔ اب "جماعتِ اسلامی" کی دعوت نے جب ایک اچھی اجتماعی جدوجہد کی راہ دکھائی تو اس کو قبول کر لیا۔ بس یہی ہے میرا اور مجھ جیسے دوسرے رفقاءِ جماعت کا بھی حال۔

مولانا مودودی کی ذاتی سرگذشت اگر اس سے مختلف ہے (جیسا کہ روداد اجتماع سے آپ نے سمجھا ہے) تو وہ ان کا ذاتی حال ہے ساری جماعت کے لیے کوئی مقررہ اصول تو نہیں ہے۔

(سوا) علی ہذا ہم کو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ اس "جماعت" میں آنا شرطِ ایمان ہے یا یہ کہ نجات اور رضاءِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے اس جماعت سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ جماعت کے پہلے اجتماع کی روداد ہی میں یہ عبارت بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی ہوگی:۔

"خوب سمجھ لیجیے کہ ہماری حیثیت بعینہٖ اس جماعت کی سی نہیں ہے جو ابتداءً نبی کی قیادت میں بنتی ہو بلکہ ہماری صحیح حیثیت اس جماعت کی ہے جو اصل نظام جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کو تازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نبی کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی ہے اور اس کے دائرے سے باہر صرف کفرہی ہوتا ہے مگر بعد میں اس نظام اور کام کو تازہ کرنے کے لیے جو لوگ اُٹھیں ضروری نہیں کہ ان سب کی بھی ایک ہی جماعت ہو ایسی جماعتیں بیک وقت بہت سی ہو سکتی ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں"۔ (روداد اجتماع اول ص۳)

پھر اس کے بعد "ترجمان القرآن" میں بھی ایک دفعہ سے زیادہ اس کے متعلق تصریحات کی گئی ہیں چنانچہ رجب و شعبان کے "ترجمان" میں اس شبہ اور اس کے جواب کا ذکر آپ نے ان الفاظ میں ملاحظہ فرمایا ہوگا:۔

"ایک اور شبہ لوگوں کے دلوں میں یہ ہے کہ عام جماعتوں کی طرح ہماری دعوت بھی شاید اپنی جماعت ہی کی طرف ہے، اور یہ کہ جو لوگ ہم سے الگ ہیں اُن کو ہم مطلقاً حق پر سمجھتے ہی نہیں .....

دراصل ہماری دعوت اُس مخصوص نظامِ جماعت کی طرف نہیں ہے جو ہم نے قائم کیا ہے بلکہ

عقیدۂ توحید و رسالت اور اُس نصب العین کی طرف ہے جو اللہ کو اپنا بادشاہ اور رسول کو اپنے بادشاہ

کا نمائندہ تسلیم کرنے کے ساتھ ہی لازماً ہر مسلمان کا نصب العین قرار پاتا ہے ...... اب جو لوگ اس عقیدہ و نصب العین میں ہم سے متفق ہیں اُن کے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ ہمارے نظامِ جماعت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور ہم پر بھی اطمینان رکھتے ہیں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں، اور اگر ہمارے نظام سے یا ہماری شخصیتوں سے وہ مطمئن نہیں ہیں تو خود اس کارِ خیر کے لیے کوئی جماعت بنائیں اور اپنی صوابدید کے مطابق جدوجہد کریں۔ دونوں صورتیں یکساں صحیح اور برحق ہونگی۔ ایسی دس جماعتیں بھی اگر بن جائیں جن کا عقیدہ اور نصب العین یہی ہو اور نظام مختلف ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہمیں ان سے رقابت نہ ہوگی، بلکہ مسرت ہوگی کہ الحمد للہ اس راستہ پر چلنے کے لیے اور قافلے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چاہے ابتداءً ہم الگ ہی چلیں، مگر مسلک و مقصد کی وحدت انشاء اللہ سب کو ایک کر دے گی۔ اور کم از کم اپنی حد تک تو ہم یقین دلانے کے لیے تیار ہیں کہ اس امرِ حق کی خدمت کے لیے کوئی دوسری جماعت جو وجود میں آئے تو اس کے ساتھ ہم بخوشی تعاون کریں گے اور اگر اُس کے نظام اور کار فرما اشخاص کو ہم نے صالح تر پایا تو ہمیں اپنے جداگانہ وجود کو ختم کر کے ان کے اندر جذب ہو جانے میں بھی ذرہ برابر تامل نہ ہو گا۔" (ترجمان القرآن بابت ماہ رجب، شعبان و رمضان سنہ ۱۳۶۰ھ صفحہ ۱۴۵)

نیز اسی بارہ میں حیدر آباد دکن کے ایک صاحب کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا تھا کہ :-

"جو شخص دینِ حق کو مغلوبی کی حالت سے نکالنے اور پوری جنسِ دین پر اسے غالب کرنے کی جدوجہد کرے وہ بہر حال ہمارے نزدیک حق پر ہے خواہ ہماری جماعت میں شریک ہو یا ہم سے الگ رہ کر اس مقصد کے لیے کام کرے، اور جو ایسا نہیں کرتا اس کو ہم عند اللہ قابلِ مواخذہ سمجھتے ہیں"۔

("صدق" ۱۴ مارچ ۱۹۴۲ء بحوالہ اخبار "مسلمان لاہور")

بہر حال یہ تو کبھی ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا اور نہ انشاء اللہ آسکتا ہے کہ "جماعت

اسلامی" میں شامل ہونا "شرائطِ ایمان" یا "ضروریاتِ اسلام" میں سے ہے اور جو لوگ ہم سے الگ ہیں وہ خدانخواستہ ہمارے نزدیک "غیر مومن" ہیں یا عدمِ شمولیتِ جماعت کی وجہ سے اُن کے ایمان واسلام میں کوئی کسر رہی ہے۔ اس قسم کے توو ساوس کو بھی ہم بدترین قسم کی گمراہی سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس ہم بہت سے اللہ کے اُن بندوں کو جانتے ہیں جو اس جماعت کے رکن نہیں ہیں لیکن ہم کو یقین ہے کہ وہ اس زمانہ کے لحاظ سے "ایمان" اور "عمل صالح" کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں، اور ان کا تقویٰ اور تورّع ہمارے لیے قابلِ رشک اور لائقِ تقلید ہے۔

الغرض "جماعتِ اسلامی" کے نظام میں باضابطہ منسلک ہونا اور اس خاص آرگنائزیشن سے وابستہ ہونا کسی شخص کے مومن بلکہ صالح ہونے کے لیے بھی ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ایمانی فریضہ اس سلسلہ میں صرف اتنا ہے کہ "جماعتِ اسلامی" کا جو عقیدہ اور نصب العین ہے، ہر مومن کا وہی عقیدہ اور وہی نصب العین ہو، اور اس کے لیے وہ اپنی جدوجہد سے غافل نہ رہے، خواہ وہ یہ کام ہمارے ساتھ ہو کر کرے یا ہم سے الگ رہ کر۔ اس اصل میں موافقت کے ساتھ عملی پروگرام کی تفصیلات میں اگر کہیں ہم سے کچھ اختلافِ رائے بھی ہو تو ہم اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ــــ غور فرمایئے! کیا ایک "نیا مذہبی فرقہ بنانے والوں" اور دوسروں کو غیر مومن سمجھ کر دعوتِ ایمان دینے والوں" کا حال یہی ہوتا ہے؟

(ج) ہاں معترضین کے اعتراض کے بعد ہی ہم میں سے بعض کو بھی یہ محسوس ہوا کہ "جماعت اسلامی" کے دستور میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے کم غور کرنے والوں کو اس قسم کے شبہات ہو سکتے ہیں یا اعتراض و تنقید ہی کی نظر سے دیکھنے والے اُن سے ایسا سمجھ سکتے اور دوسروں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتے ہیں چنانچہ فروری کے اجتماع میں ہم لوگوں نے اسی غرض سے "دستور" پر نظر ثانی کی اور جن الفاظ میں ہم نے اس قسم کے اشتباہ کی گنجائش محسوس کی ان میں مناسب ترمیم کر دی۔ دستور

کا نیا ایڈیشن تیار ہونے پر آپ اُن تمام ترمیمات کو ملاحظہ فرمالیں گے۔

(ط) بعض حضرات دستور کے لفظ "تجدید ایمان" سے بھی یہ شبہ پیدا کرتے ہیں اور آپکے گرامی نامہ میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک عام اور معروف دینی اصطلاح ہے جس سے لوگوں کو واقف ہونا چاہیے اس لیے ہم نے اس کو بدلنا اچھا نہ سمجھا۔ "تجدید ایمان" کا لفظ تو خود "ایمانِ سابق" کا پتہ دیتا ہے۔ نیز حدیثِ نبوی میں بھی خود اہلِ ایمان سے اس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا تھا کہ:-

جَدِّدُوا اِیمانکم؛ تم لوگ اپنے ایمان کی تجدید اور اس کو تازہ کرتے رہو۔

قیل یا رسولَ اللّٰہِ کیف نُجَدِّدُ ایماننا؛ عرض کیا گیا حضرت! ہم کس طرح اپنے ایمانوں کی تجدید کریں؟

قَالَ اَکثِرُوا مِن قولِ لا اِلٰہ الا اللّٰہ۔ ارشاد فرمایا لا الٰہ الا اللہ کہنے کی کثرت رکھو۔

(رواہ احمد عن ابی ہریرۃ مرفوعاً دجمع الفوائد ج ۱ ص ۱۵)

(ی) دستور میں ایک جگہ "از سرِ نو ایمان لانے" کا لفظ ہے (جو آپ کو زیادہ کھٹک رہا ہے) میں اس کے اور "تجدید ایمان" کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں وہ "تجدید ایمان" کا ترجمہ ہی ہے۔ اور اسی وجہ سے "دستور" پر نظر ثانی کے وقت ہم نے اس میں کوئی ترمیم کرنی ضروری نہیں سمجھی۔ لیکن بعد میں چونکہ اور بھی ایک دو صاحبوں نے اس کے بارے میں وہی خیال مجھ سے ظاہر کیا تھا جو آپ کو پیدا ہو رہا ہے اس لیے اب میں اس لفظ کو بھی بدل دینا ہی بہتر سمجھتا ہوں اور اب سے پہلے مولانا مودودی کو اپنا یہ مشورہ لکھ کر بھیج چکا ہوں کہ اس کی جگہ بھی وہ "تجدید ایمان" ہی کا لفظ کر دیں۔

(ک) داخلہ جماعت کے وقت "ادائے شہادتین" کا جو طریقہ رکھا گیا ہے اس کے متعلق بھی ایک سے زائد مرتبہ یہ تصریح کی جا چکی ہے کہ یہ التزام اس تصور پر مبنی نہیں ہے کہ پہلے سے شہادتین پر اس شخص کا ایمان نہ تھا یا خدا نخواستہ ہم ایمانِ سابق کو کالعدم سمجھتے ہیں، بلکہ اس کا منشا صرف استحضار، اور ایمان کو تازہ کرنا ہے۔ نیز ایک غرض اس سے یہ بھی ہے کہ جو آئے وہ حقیقتِ ایمان اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھ بوجھ کر آئے۔ مولانا

مودودی نے اس کے متعلق خود لکھا ہے کہ :-

"جماعت اسلامی" کے دستور میں شہادتین کو شرط رکنیت قرار دینے کی غرض بھی صرف یہ ہے کہ جو لوگ ارکان کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں ان کے متعلق یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صالح العقیدہ ہیں اور جاہلیت کی اُن آمیزشوں کو لیے ہوئے نہیں آرہے ہیں جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر گھس آئی ہیں۔ نیز یہ کہ دعوت الی اللہ کی خدمت شروع کرنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پھر اللہ کے ساتھ اپنے عہد و میثاق کو استوار کرلیں اور نومسلمانہ جوش کے ساتھ کام کے لیے آگے بڑھیں"۔ (ترجمان القرآن بابت ماہ رجب تا رمضان ۱۳۶۰ھ صفحہ ۱۸۵)

نیز اس ناچیز راقم الحروف نے بھی اس "تجدید ایمان" اور "ادائے شہادتین" کے متعلق "الفرقان" میں لکھا تھا کہ :-

"اس "تجدید ایمان" اور "ادائے شہادتین" کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ایمان لانے اور صدق دل سے سوچ سمجھ کر توحید و رسالت کی شہادت ادا کرنے سے جو ذمہ داریاں ایک مومن پر عائد ہوتی ہیں اُن کا احساس پھر تازہ ہو جائے اور ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے وہ اس جماعت میں داخل ہو جس کے داخلہ کی شرط بس ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کا عہد و پیمان ہی ہے ۔۔۔ نیز اس کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ خدا اور رسول پر واقعی ایمان رکھنے والے "مومنین صادقین" اور دین کے بنیادی اصولوں تک سے ناآشنا (بلکہ اُن کے منکرین تک) جس طرح "مسلم سوسائیٹی" کے مساوی درجہ کے ممبر سمجھے جاتے ہیں، "یہ جماعت" اس طرح کے خلط ملط سے محفوظ رہے اور جو آئے خدا و رسول پر ایمان رکھنے والا یا ایمان لانے والا ہی آئے۔ بہرحال "تجدید ایمان" اور سمجھ بوجھ کر "ادائے شہادتین" سے ہماری غرض صرف یہی ہے، نہ یہ کہ ہم دوسرے تمام مسلمانوں کو "غیر مومن" سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ ان اکون من الغالین۔

خود ہماری نگاہوں میں بہت سے ایسے ایمان و صلاح والے ہیں جن کا ایمان اور جن کا ورع و تقوی خود ہمارے لیے لائق تقلید نمونہ ہو سکتا ہے اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اُن محاسن اعمال میں

اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔" (الفرقان ماہ شوال ۱۳۶۰ھ صفحہ ۴۸)

غور فرمایا جائے، کیا اِن واضح تصریحات کے بعد کسی کے لیے اس شک شبہ کی گنجائش رہتی ہے کہ ہم دوسروں کو ایمان سے خالی جان کر داخلۂ جماعت کے وقت "اوارشہادتین" کا مطالبہ کرتے ہیں؟ بڑا تعجب اس وقت ہوتا ہے جبکہ اس قسم کے شبہات یا اعتراضات اُن ذی علم حضرات کی طرف سے بھی عمل میں آتے ہیں جن کے متعلق خیال نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے مشائخ کا سلف سے جو طرزِ عمل اس بارہ میں (یعنی اطاعتِ الٰہی اور انابت الی اللہ کے عہد و میثاق کے وقت "تجدید ایمان" اور "اداء شہادتین" کے بارہ میں) رہا ہے اس سے واقف نہ ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "القول الجمیل" میں "بیعت کا ماثور عن السلف" طریقہ اور اُس کے الفاظ بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"اخذ بیعت کے وقت "شیخ" پہلے خطبہ مسنونہ پڑھے (الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ الخ)

ثم یُلقّنہ الایمانَ الاجمالیَّ فیقول	پھر اس کو ایمان اجمالی کی تلقین کرے اور یوں کہے
قل اٰمنت باللہ وبما جاء من عند	کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے
اللہ علی مراد اللہ، واٰمنت برسول اللہ	جو کچھ آیا ہے اُس پر بھی اُس کی مراد کے مطابق
وبما جاء من عند رسول اللہ علی مراد	ایمان لایا، اور میں اللہ کے رسول پر ایمان لایا
رسول اللہ وتبرأت من جمیع الادیان	اور رسولِ خدا کی طرف سے جو تعلیمات آئی ہیں
وجمیع العصیان، واسلمت الاٰن واقول	اُن پر بھی ایمان لایا مطابق اس کے جو رسول کی
اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان	مراد ہو۔ اور میں تمام دوسرے دینوں اور ہر قسم کی
محمداً عبدہٗ ورسولہ۔	نافرمانیوں سے بری اور بیزار ہوا اور اب میں نے اسلام کو اختیار
(شفاء العلیل صفحہ ۲۲)	کیا اور میں کہتا ہوں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان

محمداً عبدہٗ ورسولہ۔"

الغرض "جماعتِ اسلامی" میں داخلہ کے وقت جس کی حیثیت اسلامی مطالبوں کو پورا کرنے، ایمانی تقاضوں پر عمل کرنے اور خصوصاً اعلاءِ کلمۃ الحق کے لیے ایک نظام کے ماتحت جدوجہد کرنے کے واسطے "عہد و میثاق" کی ہے، اور جو درحقیقت ایک قسم کی "بیعت" ہی ہے (تو اس عہد و میثاق اور اس بیعت کے وقت) "تجدیدِ ایمان" اور "ادائے شہادتین" کا جو طریقہ جماعت کے دستور میں رکھا گیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کوئی "منکر" اور قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے، بلکہ بزرگانِ سلف کا مسلوک طریقہ بھی ہے جس کو ہمارے اُن مشائخ نے غالباً انہی مصالح کی وجہ سے اختیار کیا تھا جن کے پیشِ نظر ہم کو یہ اختیار کرنا پڑا ہے۔

—— خیر یہ تو "جواب" تھا اور صحیح اور واقعی جواب —— اس کے بعد میں آپ کو بتلاؤں کہ اب سے کئی مہینہ پہلے بعض تجربات کے بعد خود میں نے مولانا مودودی سے عرض کیا تھا کہ بعض اوقات ہمارے افہام و تفہیم کے باوجود لوگوں کو اس "ادائے شہادتین" کے متعلق یہ خلجان رہتا ہے کہ شاید ہم اپنی جماعت کے علاوہ دوسروں کو "مومن" نہیں سمجھتے اور اس لیے پہلے ہم کلمۂ شہادت پڑھوا کر "تجدید ایمان" کراتے ہیں، یا کم از کم یہ کہ ہم اپنے کو تمام دوسرے مسلمانوں سے زیادہ باایمان سمجھتے ہیں، اس لیے میری رائے ہے کہ اس کو شرطِ لازم نہ رکھا جائے بالخصوص جبکہ جماعت میں داخل ہونے والے شخص کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ بحمد اللہ حقیقتِ ایمان سے وہ اچھی طرح باخبر اور اس کی ذمہ داریوں کو پوری طرح سمجھنے والا ہے۔ تو ایسی صورت میں مناسب ہے کہ ہم اس خواہ مخواہ کی "تہمت" اور غلط گمانی سے بچنے کے لیے "ادائے شہادتین" کے مطالبہ کا التزام نہ کیا کریں۔ تو مولانا نے میری اس گذارش کو مان لیا تھا، اور اب خود میرا طرزِ عمل بھی یہی ہے کہ جہاں مناسب سمجھتا ہوں ایسا ہی کرتا ہوں۔

الغرض "تجدیدِ ایمان" یا "ادائے شہادتین" کے لفظوں کی بنیاد پر "جماعتِ اسلامی" یا مولانا مودودی کے متعلق اس قسم کے جو خیالات پکائے اور پھیلائے جاتے ہیں ہم سب بحمد اللہ اُن سے بری ہیں، ان چیزوں سے ہماری جو غرض اور جو مقصد ہے وہ وہی ہے جو بار بار عرض کیا جا چکا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا مودودی کے بعض مضامین یا "دستور جماعت" میں آئے ہوئے لفظ "قومی مسلمان" "نسلی مسلمان" یا "مردم شماری کے مسلمان" سے بھی خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم دوسرے تمام مسلمانوں کو دینی مسلمان نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اصلیت اور حقیقت وہی ہے جو اوپر عرض کی جا چکی ہے کہ "ملتِ اسلامیہ" کے موجودہ اجتماع میں جو لوگ واقعی اللہ و رسول پر ایمان رکھتے ہیں اُن کو بحمداللہ ہم مومن ہی سمجھتے ہیں اور اُن میں سے بہت سوں کو تو اپنے سے بدرجہا اچھا مومن بھی جانتے ہیں، لیکن جو لوگ واقعتاً صرف نسل ہی کے اعتبار سے "مسلمان" ہیں اور بس اسی حیثیت سے مسلمان ہیں کہ وہ "مسلمان قوم" کے ایک فرد ہیں (جیسے کہ کتنے ہی ہندو، ہندو دھرم سے آزاد بلکہ بیزار تک ہونے کے باوجود صرف اس لیے "ہندو" ہیں کہ ہندو سوسائیٹی کے ایک فرد ہیں) تو اُن کے لیے "نسلی مسلمان" اور "قومی مسلمان" یا "مردم شماری کے مسلمان" کے علاوہ، آخر اور کیا لفظ استعمال کیا جائے؟ جو لوگ دین کے اساسی اصولوں تک سے بے بہرہ ہوں، بلکہ اُن میں سے بہت سے اُن سے منحرف بھی ہوں، اور جن کے نزدیک اللہ و رسول کے احکام کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، اور زندگی کی کسی منزل میں بھی وہ یہ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھتے ہوں کہ اللہ و رسول نے اس بارہ میں کیا ہدایت دی ہے، اور جن کے تمام مشاغلِ حیات گواہی دے رہے ہوں کہ وہ اپنے سامنے دنیا کی خوش عیشی کے سوا کوئی اور مقصد نہیں رکھتے (اور کون آنکھوں والا ہے جو اس سے انکار کر سکے کہ ہماری "مسلمان قوم" میں ایسے افراد لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں) تو اُن لوگوں کو اگر قومی مسلمان، نسلی مسلمان، یا مردم شماری کے مسلمان، نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے؟ ایسوں کو دینی مسلمان اور واقعی مومن کہنا تو صرف جھوٹ اور خلافِ واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام و ایمان پر سخت ترین ظلم اور دین کی تغییر بھی ہے۔

میرے یہ لفظ شاید آج کل کے "قومیت" کے شور و غوغے میں بہت ہی شاق گذریں گے لیکن میں پوری دیانتداری سے یہی سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہو جس سے ہم اُن "غیر مومن مسلمانوں"

کا "مسلمان" ہونا خود اُن کو اور دُنیا کو بتلا سکیں تو یہ دین کی بہت بڑی خدمت ہوگی، اور "اسلام" "اللہ کا دین" ہونے کے بجائے آج "ہندویت" کی طرح جو ایک قومی ٹائیٹل ہو کر رہ گیا ہے اور مسلمان "حزب اللہ" ہونے کے بجائے جو ایک قومی نقطۂ نظر رکھنے والی "قوم" ہو کر رہ گئے ہیں جس نے حقیقت کو بالکل ہی بدل دیا ہے اور اسلام و ایمان کی دعوت کی راہ میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں، تو ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ اسی طرح ہو سکے گا۔ مجھے آپ کے اس خیال سے قطعی اختلاف ہے کہ موجودہ مسلمان قوم کو ایک "قوم" بنانے والی چیز اللہ کی ہدایت اور اس کے رسول کے پیغام سے وابستگی ہے۔ واقعتاً ایسا ہوتا تو ہماری اس قومیت کے دائرے میں اُن لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی جو اللہ کی اس ہدایت اور اس کے رسول کے اس پیغام سے عملاً کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس قوم کے فرد مانے جاتے ہیں بلکہ ان کی یہ حالت قومی سرداری کے منافی بھی نہیں سمجھی جاتی اور کتنے ہی ہیں جو ایسے ہونے کے باوجود قوم کے لیڈر بھی ہیں۔

دیکھیے غلط فہمی نہ ہو میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ ساری قوم ہی ایسی ہے۔ بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ "قوم" میں ایسے بھی موجود ہیں، حالانکہ ہمارے اور ان کے درمیان وجہ جامع اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ بھی مسلمان نسل کے ہیں، اور مسلمان قوم کے فرد ہیں، اور "سرکار" میں ان کا مذہب مسلمان لکھا جاتا ہے اور صرف انہی وجوہ سے وہ سیاسی پلیٹ فارم پر "مسلمانوں کے لیڈر" اور کونسلوں اسمبلیوں میں "مسلمانوں کے نمائندے" ہیں۔ تو اس "ذرہ ذرہ مسلم قومیت" کے متعلق میں ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بنیاد اللہ و رسول نے رکھی ہے۔

میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کا کوئی خاص تعلق "جماعتِ اسلامی" کے معاملہ سے نہیں ہے بلکہ جب سے مجھے کچھ دینی شعور حاصل ہوا ہے اُسی وقت سے میرے خیالات اور میری فکر کا یہ مرکزی نقطہ رہا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ کسی بھی ایسے شخص کی رائے

اس سے مختلف نہ ہوگی جو دین اور اس کے مقتضیات کا بھی صحیح علم رکھتا ہو اور موجودہ "مسلمان قوم" کی حالت بھی اس کے علم میں ہو۔ آپ کے متعلق مجھے گمان ہوتا ہے کہ شاید آپ ہمیشہ کسی اچھے اور ایمانی ماحول ہی میں رہے ہیں اور اس لیے آپ نے "مسلمانوں" میں صرف "مسلمان" ہی دیکھے ہیں۔

بہرحال میں اس معاملہ میں اپنے دماغ میں کوئی الجھن اور کوئی شک و شبہ نہیں رکھتا کہ آج کل کی "مسلمان قومیت" اور "اصل اسلامیت" بالکل الگ کی دو چیزیں ہیں اور اِن دونوں کے فرق کو صاف کر کے اصل اسلامیت کا تعارف کرانا ہمارا اہم دینی فریضہ ہے ـــ لیکن اس اجمالی اور اصولی تصور کے باوجود ملت کے عام افراد و اشخاص کے ساتھ (جن کے متعلق ہم کو متعین طور سے معلوم نہیں ہے کہ وہ ایمان کے ادنیٰ درجہ سے بھی خدانخواستہ خالی ہیں) ہمارا برتاؤ مسلمانوں ہی کا سا رہے گا، ہم اُن کو اخوانِ ملت ہی سمجھتے ہیں اور سمجھیں گے۔

نیز عام مسلمانوں کے لیے ہماری دعوت الی اللہ بھی ان کو نسیان زدہ اور سبق بھلا دینے والی "امت" سمجھ کر ہی ہے اور ہوگی، نہ کہ کھلے غیر مسلموں کی طرح ان کو "منکرینِ اسلام" قرار دے کر، اور ان دونوں پوزیشنوں میں جو فرق ہے وہ یقیناً آپ سے مخفی نہ ہوگا۔

(ل) آپ نے لکھا ہے کہ مولانا مودودی کی جن تالیفات کو "جماعت کا لٹریچر" کہا جاتا ہے اُن میں کچھ باتیں غلط اور خلافِ صواب بھی موجود ہیں۔ اور اُن کی ایک مثال بھی آپ نے "الجہاد" سے پیش کی ہے۔

میرے محترم! الجہاد تو مولانا مودودی کی اب سے کوئی پندرہ برس پہلے کی تصنیف ہے (جبکہ اللہ کے سوا شاید کسی کے بھی علم میں نہ ہوگا کہ سنہ ۱۳۶۰ھ میں "جماعت اسلامی" بنے گی اور مولانا اس کے لیڈر ہوں گے) لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ انھوں نے جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد یا اس سے کچھ پہلے بھی جو کچھ لکھا ہے (جس کا جماعتِ اسلامی سے بہت قریبی تعلق ہے) ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سب بھی ہمارے نزدیک صحیح و صواب ہی ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو انھوں نے صحیح سمجھ کر لکھا ہو اور

ہمارے نزدیک وہ صحیح نہ ہو ہیں نے "الجہاد فی الاسلام" کو اور اسی طرح مولانا مودودی کی اکثر تالیفات
کو بالاستیعاب آج تک نہیں دیکھا ہے۔ ہاں جستہ جستہ نظر قریب قریب سب ہی چیزوں پر پڑی ہے اُن
کے مضامین کے جو مجموعے اب کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اُن کے اکثر مضامین بھی کبھی "ترجمان
القرآن" ہی میں پڑھ لیے ہیں۔ مجھے ان چیزوں میں متعدد مقامات ایسے یاد ہیں جہاں میں اُن کی تحقیق اور
ان کی فکر کو اپنی دانست میں صحیح نہیں سمجھتا مثال کے طور پر لکھتا ہوں کہ انھوں نے ایک اہم استفتا کے
جواب میں نفس مسئلہ مسؤل عنہا کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے میں فقہی حیثیت سے اسے صحیح نہیں سمجھتا،
بلکہ اس باب میں اُس رائے کو صحیح سمجھتا ہوں جو دوسرے علماء نے اختیار کی ہے (اور خود مودودی
صاحب نے بھی "حقوق الزوجین" میں اپنی "اصلاحی تجاویز" کی بنیاد اُس پر رکھی ہے اور موجودہ وقت میں
اُس کو "حد جواز" میں لکھا ہے)۔ البتہ میں اُن کی "جوابِ استفتا" والی تحریر کی بھی اس لحاظ سے قدر کرتا ہوں
کہ وہ "اسلامی نصب العین" کو یاد دلاتی اور ہم کو توجہ دلاتی ہے کہ "غیر الٰہی نظام" کے تسلط کے وقت میں
محض عارضی طور پر اور بدرجۂ مجبوری ہی حد جواز کے اس طریقہ کو ہم اختیار کر سکتے ہیں اور ہمارا اصل
فرض اس مجبوری کی لعنت ہی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کرنا ہے۔

علیٰ ہذا "دین کی چار بنیادی اصطلاحوں" کے عنوان سے "ترجمان" میں جو مضمون ان کا نکل رہا ہے جس کا
نسبتہً جماعت سے بہت قریبی تعلق ہے، اس کے اصلی مقصد و مدعا سے متفق ہونے کے باوجود اس کے بعض
حصوں سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہے۔

اور یہ تو میں نے صرف مثالاً ایک دو چیزیں لکھ دی ہیں ورنہ ان کی تحریروں میں بہت سی ایسی
چیزیں ہیں جن سے مجھے اختلاف ہے۔ لیکن اس قسم کے اختلافِ آراء سے اس قسم کی کوئی جماعت بھی
نہیں بچ سکتی۔ بایں ہمہ ایک عام خیال ان کی تحریرات کے متعلق میرا یہی ہے کہ ان کا بہاؤ پورے
زور کے ساتھ اسلامیت اور خدا پرستی کی طرف کو ہوتا ہے۔ اور ان کا مطالعہ ایمان میں بصیرت اور

حرارت ہی کا اضافہ کرتا ہے۔ بالخصوص "جماعتِ اسلامی" کا جو مقصد و نصب العین ہے اور اس کے پیشِ نظر جو کام ہیں ان کو سمجھنے اور اپنا مقصدِ حیات بنا لینے کی طرف مولانا مودودی کی بیشتر تحریرات اچھی ہی رہنمائی کرتی ہیں اور بس اسی لحاظ سے وہ "جماعتِ اسلامی" کا لٹریچر ہیں، نہ یہ کہ اُن میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ تمام رفقاءِ جماعت کے نزدیک جزءاً جزءاً صحیح اور مسلّم ہے۔

شاید آپ نے غور نہیں فرمایا پہلے اجتماع کی روداد میں مولانا مودودی صاحب کی طرف سے نہایت صفائی کے ساتھ یہ بات ظاہر کر دی گئی ہے کہ فقہی یا کلامی مسائل میں اُن کا جو طریقہ فکر اور جو نتائج تفکر ہیں، رفقائے جماعت کا اُس سے موافقت کرنا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہی تو ہوا کہ ہم "جماعتِ اسلامی" میں منسلک ہونے کے باوجود اُن کی تحقیقات سے اختلاف رکھ سکتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ہم اُسی چیز سے اختلاف کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح نہ ہو گی۔ تو اگر انھوں نے "الجہاد فی الاسلام" یا اپنی دوسری کتابوں میں کچھ ایسی باتیں لکھی ہوں جو ہمارے یا آپ کے نزدیک صحیح نہ ہوں تو ہم پر یا آپ پر یا "جماعتِ اسلامی" پر اس کا کیا اثر؟ ایسے مواقع پر ہمارا کام یہی ہے کہ ہمارے نزدیک جو چیز صحیح ہے ہم اُس کو ان تک پہنچا دیں اور اُن کی غلطی پر ان کو مطلع کر کے اصلاح و تصحیح کی طرف ان کو توجہ دلائیں (بشرطیکہ ان کی بات کا غلط اور ناصواب ہونا ہمارے نزدیک متعین ہو) اور اگر اس کے بعد بھی وہ اپنی ہی رائے پر قائم رہیں اور اپنی غلطی محسوس نہ کریں، اور ہماری نظر میں وہ غلطی دیانتداری کے ساتھ "منکر" درجہ کی ہو اور اجتہادی قسم کی چیز نہ ہو جس میں اختلاف اور تعددِ آراء کی گنجائش ہوتی ہے) تو زیادہ سے زیادہ ہمارے ذمہ بس اتنا ہے کہ اپنے اختلاف اور نکیر کو ظاہر کر دیں۔ اور اگر خدانخواستہ امیرِ جماعت سے (خواہ مولانا مودودی ہوں یا کوئی اور) کوئی غلطی ایسی ہو جو حدِ ضلال" تک پہنچتی ہو تو پھر اس سے رجوع کرنے کا اور اس پر اصرار کرنے کی صورت میں اُس سے "انعزال" کا یا "جماعت" سے معزول کر دینے کا ہم مطالبہ کر سکتے ہیں ___ لیکن "الجہاد فی الاسلام" کی جس غلطی کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے وہ بس ایک علمی غلطی کہی جا سکتی

ہے۔ اس سے زیادہ میرے خیال میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اور اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ ایسا شخص کیوں جماعت کا امیر اور لیڈر ہے جو ایسی غلطیاں کرسکتا ہو تو گزارش یہ ہے کہ وہ کون مصنف ہے جس کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات میں ناقدوں نے دوچار غلطیاں بھی نہ نکال دی ہوں یا نہ نکال سکتے ہوں۔ میرے بہت سے علمی بزرگ ہیں جن کے علمی تبحر اور تفقہ فی الدین کا میں پوری طرح معترف ہوں، اُن کو عہدِ حاضر کے "علماء راسخین" میں سے سمجھتا ہوں اور خاص مہمات میں ان کی طرف رجوع بھی کرتا ہوں، بایں ہمہ اُن کی بعض علمی تحقیقات کو میں صحیح نہیں سمجھتا حالانکہ جانتا ہوں کہ میں خود ان کے تلامذہ اور خدام کی آخری صف میں بیٹھنے کے لائق بھی نہیں ہوں۔ بہرحال اگر مولانا مودودی کی تحریرات میں ایسی بہت سی غلطیاں بھی موجود ہوں تو "جماعت اسلامی" پر اُن کا کوئی اثر نہیں۔ اور نہ ہم نے یہ سمجھ کر ان کو جماعت کا امیر چنا ہے کہ وہ خود یا اُن کا علم و فکر "محفوظ عن الخطا" ہے۔ تاہم جیسا کہ میں نے عرض کیا ان غلطیوں سے ان کو آگاہ کرکے ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلانا ہمارا ایک نیک کام ہوگا، اور اس نیکی کے لیے مودودی صاحب یا رفقاء جماعت ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر مسلمان کا ہم پر حق ہے کہ اگر ہم اس کو کسی ایسی غلطی میں مبتلا دیکھیں تو اُس کو اس سے نکالنے کی کوشش کریں اور علیٰ ہذا اگر ہم سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے تو وہ ہم کو اس پر متنبہ کردے۔ البتہ مولانا مودودی اور ہم آپ چونکہ ایک راہ کے رفیق ہیں، اور ہمارا ایک خاص دینی رشتہ بھی ہے اس لیے ہم پر ایک دوسرے کی "نصیحت" اور "تعاون علی البر والتقویٰ" کی ذمہ داری دوگونہ ہے:

الدین النصیحۃ للّٰہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم۔

الصَّوْم

(از جناب مولانا سید محمد جعفر صاحب پھلواروی)

یہ پوری کائنات ایک باقاعدہ اور منظم سلطنت ہے۔ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر واقعہ یوں ہی ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم ایک مربوط سلسلہ ہے۔ اس کی مربوطیت اور باقاعدگی خود بتاتی ہے کہ اس پورے نظامِ سلطنت کو ایک ہی فرمانروا بغیر کسی مدد کے چلا رہا ہے اور انسان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اسی مالک الملک کی ایک ادنیٰ رعیت ہے اور اس کی خیر اسی میں ہے کہ وہ اس احکم الحاکمین کی وفادار و فرمانبردار رعایا بن کر رہے ۔۔۔ اسلامی نظامِ زندگی کا بنیادی تصور یہی ہے اور انسانوں سے اس کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے مومن و مسلم (وفادار و فرمانبردار) بن کر رہیں۔

یہ مطالبہ بالکل صحیح اور حق بجانب ہے۔ انسان نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا ہے اور اس لیے یقیناً وہ اپنی اُن قوتوں کا بھی خود خالق نہیں جو اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ پس یہ قوتیں جہاں سے آئی ہیں وہی ان کا خالق اور مالک ہے اور انسان اُن کا فقط امانتدار ہے، اور امانتدار کا فرض یہ ہے کہ وہ امانت کو اس کے مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کرے، ورنہ وہ امین نہیں ہوتا خائن قرار پاتا ہے اور جس نوع کی خیانت ہوتی ہے اسی نوع کی سزا بھی دی جاتی ہے، اور جس درجہ کی امانتداری ہو ویسا ہی انعام ملتا ہے۔

اپنی ہر قوت کے استعمال میں انسان ایک ہی وقت میں مجبور بھی ہے اور قادر بھی، مقید بھی ہے آزاد بھی۔

وہ آنکھ سے دیکھنے ہی پر مجبور ہے، کانوں سے بول نہیں سکتا، ناک سے سننے پر قادر نہیں، ہاتھوں میں ذائقہ لانے سے عاجز ہے، زبان سے دید و شنید محال ہے۔ وہ مجبور ہے کہ چار و ناچار اپنی ہر قوت سے وہی کام لے جس کے لیے واضعِ قدرت نے اُسے وضع کیا ہے۔ یعنی لامسہ سے چھوئے، ذائقہ سے چکھے، سامعہ

سے سُننے وغیرہ جیسا۔ غرض اس کی ہر قوت مجبور ہے کہ اسی قانون پر چلے جو انسان سے مشورہ کیے بغیر اوران قوتوں سے ووٹ لیے بغیر متقنن فطرت نے بنادیا ہے۔

اسی طرح انسان اس پر بھی مجبور ہے کہ اپنے پھیپھڑے سے کام لیتا رہے اور تار نَفَس کا سلسلہ لا متناہی لگا تار قائم رکھے، معدہ خالی ہو تو کھانا کھائے، حلق خشک ہو تو پانی پیے، ولولۂ شباب سے مغلوب ہو تو وسائل نسلیہ کی جستجو کرے ____

آپ نے دیکھا انسان سر سے پاؤں تک کتنا مجبور، کیسا بے بس اور کس قدر بے اختیار واقع ہوا ہے؟ ان مجبوریوں میں ایک بھی تو ایسی نہیں جس کا مقابلہ کر کے انسان اپنی ہستی کو باقی رکھ سکے، ایک قانون بھی تو ان قوانین تکوین وفطرت میں ایسا نہیں جسے توڑ کر انسان بقاء وجود کا لفظ بھی زبان پر لاسکے۔ لیکن اسی انسان کی جامع الاضداد ملاحظہ ہو، ایک طرف تو یہ بے بسی وبے اختیاری اور یہ عاجزی ومجبوری ہے اور دوسری طرف اختیارات کا سمندر اس کے کوزے میں سمویا ہوا ہے، قدرتوں کی لامحدود دنیا اس کی مٹھی میں ہے اور اس کی خود مختاری کا طول وعرض ناقابل پیمائش ہے۔

بے بسی یہ ہے کہ وہ آنکھوں سے صرف بصارت کا کام لے سکتا ہے اُن سے چکھ نہیں سکتا، سونگھ نہیں سکتا، بول نہیں سکتا، سُن نہیں سکتا۔ کیسی بیکسی اور کس درجہ مجبوری ہے لیکن ساتھ ہی اس کی ہمہ گیری ووسعت کو دیکھو کہ پوری کائنات ذرا سی مردمک (پُتلی) میں سمائی ہوئی ہے۔ اختیارات کی لامحدودیت ملاحظہ ہو، وہ جو کچھ چاہے دیکھ سکتا ہے، جب چاہے دیکھ سکتا ہے، جتنی بار چاہے دیکھ سکتا ہے، جتنی دور چاہے دیکھ سکتا ہے۔ اور آج اسکی قوت باصرہ کی اختیاری وسعت کو تم دیکھ رہے ہو کہ کرۂ ماہ کو ۲۴ لاکھ میل سے کھینچ کر صرف ۵ میل پر لے آئی ہے۔ اس چھوٹی سی مردمک میں قدرت و اختیار کی کتنی وسیع دنیا سموئی ہوئی ہے کہ وہ جس شے کو چاہے دیکھے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ ورق قرآن کو دیکھے یا اس پر عمل کرے کہ ؎

بر مصحف روے او نظر کن   خسرو غزل وکتاب تا کے؟

وہ چاہے تو پوری کائنات کو دیدۂ اعتبار سے دیکھے اور چاہے تو اپنا سارا وقت تصاویر عریاں کا البم دیکھنے میں صرف کردے

آزادی و اختیار کو بھی خدا ہی کے قانونِ ہدایت کے مطابق کر دینا آنکھوں کی خدا بندگی و غلامی ہے یعنی آنکھوں سے صرف وہ دیکھا جائے جس کے دیکھنے کا آنکھیں بخشنے والا روادار ہو اور وہاں سے نظر ہٹالی جائے جہاں نظر جمانا اس مالک کی مرضی کے خلاف ہو۔ کانوں سے وہی سنا جائے جس کے سننے کی اجازت مالک نے دی ہو، زبان سے وہی چکھا یا بولا جائے جس کے چکھنے یا بولنے کے لیے مولا کے حکم میں کوئی گنجائش موجود ہو غرض اپنی ساری قوتوں کو اس آقائے یکتا کی مرضی کے مطابق بنا لیا جائے حتیٰ کہ دل اور دماغ سے صرف وہی باتیں سوچی جائیں جن کے لیے مالک کا قانون کوئی روک نہ پیدا کرتا ہو۔ اپنے کھانے کو اسی کے حکم کا تابع کر دے، اپنے مشرب کو اسی کے قانون کا مطیع کر دے اور اپنے حیوانی عنصر کی تسکین کو اسی کی ہدایت کے ماتحت رکھے ــــ صوم اسی حقیقت کا بلکہ اس حقیقت کی مشق کا دوسرا نام ہے۔

صوم کا مقصد صرف "مفطراتِ ثلٰثہ" (کھانا، پینا اور قربتِ زوج) کے باب میں ہی اطاعت قانون کرانا نہیں بلکہ زندگی کے تمام مسائل میں قانونِ الٰہی کی اطاعت ــــ اطاعت کی روح ــــ پیدا کرنے کی مشق کرانا ہے۔ مفطراتِ ثلٰثہ تو در اصل شہواتِ نفس یعنی دلی خواہشوں کے تین اہم شعبے ہیں۔ ایسے اہم شعبے کہ ان ہی کی خاطر انسان وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جو اسے نہ کرنا چاہیے۔ ان تین پر قابو پانے کے معنی اس مرکزی نقطے اور اس اصل جامع کو قابو میں لانے کے ہیں جس سے یہ تین اہم شاخیں پھوٹتی ہیں، اور جن کی معاونت میں سرکشی و بغاوت کے تمام شعوب خود بخود شریک ہو جاتے ہیں۔ چور اپنی چوری کو، ڈاکو اپنے ڈاکے کو، رشوت خوار اپنی رشوت کو، خائن اپنی خیانت کو اور ظالم اپنے ظلم کو یقیناً حق نہیں سمجھتے لیکن اپنے اپنے کام سب کیے جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ شکم سے مجبور بلکہ شکم کے غلام ہیں۔ قومِ طالوت نے باوجود نہی پیغمبری کے نہرِ مبتلابہ کا پانی پی لیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ پیاس نے نافرمانی پر مجبور کر دیا۔ ہاروت و ماروت (اگر روایت کی نوعیت صحیح تسلیم کر لی جائے) چاہِ بابل میں معکوس معلق ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اپنے حیوانی عنصر پر قابو نہ پا سکے۔ اسی جذبۂ حیوانی کی تسکین کی خاطر بھائی نے بھائی کو، باپ نے بیٹے کو، عاشق نے رقیب کو اور فرمانرواؤں نے فرمانرواؤں کو تہ تیغ کیا۔ خوب غور سے دیکھ جاؤ، دنیا میں تمام فسادات کی تہہ میں یہی تین چیزیں کار فرما نظر آئیں گی اور ان تینوں کا مرکز صرف ایک ہے یعنی خواہشِ نفس کی الوہیت و فرمانروائی اور انسان کا اس کی بندگی اختیار کر لینا اَرَأَيْتَ مَنِ

اَتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ؟" پس اس جھوٹے الٰہ کو زیر کر لینے کے معنی اس دار السلطنت پر قابو پا لینے کے ہیں جہاں سے تمام قوائے فساد کا نفاذ ہوتا ہے۔

یہاں پر واضح رہے کہ کسی اخلاقی نظام کی تعمیر صرف قانون سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ صرف قانون سے کچھ دیر کے لیے ممکن ہے کوئی اخلاقی تعمیر ہو جائے لیکن جلد ہی اس کا نتیجہ فساد ہوگا۔ قانون کی اطاعت وہاں ہو سکتی ہے جہاں مقنن سے کوئی دنیوی امید یا خوف ہو۔ لیکن جہاں ان دونوں کا فقدان ہو وہاں کونسی چیز انسان سے اطاعت قانون کرا سکتی ہے؟ اور وہ کونسا فرد یا جماعت ہے جس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت میں اس مقنن کا خوف یا امید ہر لحظہ مسلط ہو؟ دل میں بھی اور ظاہر میں بھی خلوت میں بھی جلوت میں بھی، نور میں بھی ظلمت میں بھی، آبادی میں بھی ویرانے میں بھی، شہادت میں بھی غیب میں بھی، زندگی میں بھی مرنے پر بھی؟ اور وہ کونسا مقنن ہے جس کے متعلق ایک منٹ کے لیے بھی یہ باور ہو سکے کہ وہ خود بے غرض اور صمد ہے، ہر انسان کا یکساں خیر خواہ ہے، لغزشوں سے پاک و سبوح و قدوس ہے اور کل اپنی اغراض سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی تبدیل کلمات و قانون نہ کر دے گا جس سے ہمارا آج کا فائدہ کل کے نقصان سے بدل جائے؟۔ پس انسانوں کی سلامتی، عالم کا امن، اخلاق کی تعمیر اور فساد کا فقدان صرف اسی پر موقوف ہے کہ انسان اپنے حق قانون سازی سے دستبردار ہو جائے اور یہ حق تقنین صرف اس اللہ واحد کے لیے مخصوص سمجھے جو مذکورہ تمام انسانی کمزوریوں سے مُبرّا و پاک ہو۔

اس حقیقت کا یورپ کو بھی عملاً اعتراف ہے۔ بعض یورپی ممالک نے یہ اصول بنایا ہے کہ (king never errs) بادشاہ لغزشوں سے پاک ہے یعنی سبوح و قدوس ہے۔ اس اصول کی غلطی اتنی ہی واضح ہے جتنی خود اصول بنانے والوں کی بیان ہم ان کو اپنے استحکام کے لیے کسی خدا ہی کو جھوٹا سچا واسطہ بنانا پڑتا ہے۔ خود تاجدار برطانیہ کی تخت نشینی کے وقت یورپ یوں اقرار کر لیتا ہے کہ گویا کہ بادشاہت مسیح کی ہے ہماری نہیں . . . . "۔ مجالس قانون ساز کے ممبروں سے خدا ہی کو واسطہ بنا کر حلف وفاداری لیا جاتا ہے۔ عدالتوں میں خدا اور مذہب ہی کا واسطہ لا کر بیان لیا جاتا ہے۔ فوجی سپاہی سے بھی بواسطہ خدا ہی اقرار اطاعت کرایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وائسرائے سے ساحل ہند پر قدم رکھنے سے پہلے ہی بائبل ہاتھ میں دے کر وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے۔ یعنی دل میں سب یہی سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی مافوق طاقت کا

واسطہ نہ ہو اس وفاداری کا کوئی یقین نہیں ہو سکتا اور قانون کی اطاعت کسی ایسی ہستی کی مدد کے بغیر نہیں کرائی جا سکتی جو انسانی کمزوریوں سے پاک نہ تسلیم کی جاتی ہو۔

اگر طولِ بے محل کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم بتاتے کہ اس صحیح واسطہ کا طریقِ استعمال کتنا غلط رکھا گیا ہے جس کے نتیجہ میں یہ واسطہ فقدانِ واسطہ سے زیادہ مضر ثابت ہوا ہے۔ بہر کیف یہ مسلّم ہے کہ اطاعتِ قانون کے لیے خود مقنن کے ساتھ خوف و امید کا غیر فانی تعلق ضروری ہے۔ لیکن یہ عجیب بے جوڑ اور لایعنی منطق ہے کہ قانون ہو انسان کا اور خوف و رجا ہو اللہ سے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قانون ہو خدا کا اور خوف و رجا کا تعلق ہو انسان سے۔ خدا جس چیز کا مطالبہ اپنے بندوں سے کرتا ہے وہ یہ ہے کہ میرے ہی قانون کی اطاعت کرو اور مجھ ہی سے خوف و امید رکھ کر۔

قانون خواہ الٰہی ہو یا انسانی، ظاہر میں دونوں ہی قانون ہیں اور دونوں ہی ممکن العصیان ہیں۔ جو بندوں کے قانون کو توڑ سکتا ہے وہ خدا کے قانون سے بھی بغاوت کر سکتا ہے۔ قانونی بغاوت و نافرمانی سے روکنے والی چیز خود قانون نہیں بلکہ قانون کی وہ روح ہے جو ہر لحظہ انسان کی روح میں ساری و جاری اور اس کے قلب و دماغ پر قابض و مسلّط ہو۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے مجموعۂ خوف و رجا اور مختصر لفظوں میں تقوی اللہ کہتے ہیں۔ قانون خود اپنی اطاعت نہیں کراتا بلکہ تقویٰ کراتا ہے۔ تقویٰ کا سارا تعلق قلب و روح سے ہے اور قانون کی گرفت روح و قلب پر نہیں ہوتی۔ صوم اسی کیفیتِ تقویٰ کو پیدا کرنے کی ایک مشق ہے۔ اور یہ طرفہ تماشا صرف اس خدائی قانون میں ہے کہ یہ نرا قانون ہی نہیں بلکہ روحِ قانون بھی ساتھ ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس میں فقط قانونی صوم کی اطاعت ہی مطلوب نہیں بلکہ مطلق قانون کی روح یعنی تقوی اللہ کی تدریب و مشق اور تمرین و تعلیم بھی ہے۔ اور اسی مقصد کو دو لفظوں میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ فرما کر بیان کیا گیا ہے۔ یہی وہ روح ہے جو بسیط ہو کر انسان کو ہر ہر قدم پر تمام شعبۂ زندگی میں قانونِ الٰہی کا پابند بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ تقویٰ اور یہ روحِ قانون اگر نہ ہو تو سارے قوانینِ الٰہی بھی قابلِ شکست اور ممکن المعصیت قوانین بن کر رہ جاتے ہیں، اُن میں اور انسانی قوانین میں زیادہ فرق نہیں رہ جاتا اور صوم ہوتا بھی ہے تو "بریت" سے کوئی ممتاز عبادت نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سارا زور اسی تقوی اللہ پر صرف کیا گیا ہے۔ ہر قانون

کے ساتھ ساتھ تقویٰ پر زور ہے، تمام قصص میں جگہ جگہ تقویٰ کی طرف عطفِ توجہ ہے، سارے اوامر و نواہی تقویٰ کے ذکر سے پُر ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی الٰہی قانون بھی اپنی اصلی اسپرٹ کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا اور کسی اخلاقی نظام کی تعمیر اس بنیاد کے بغیر ناممکن ہے۔ امریکہ کے قانونِ نشہ بندی کا حشر آپ دیکھ چکے ہیں۔

اب اسی نقطۂ نظر سے صوم کو دیکھو۔ صائم شب کو اٹھتا ہے اور سحری کھانی شروع کرتا ہے۔ ابھی آدھی سحری کھائی تھی کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وقت ختم ہوگیا اور وہ وہیں اپنے لذیذ کھانے کو چھوڑ دیتا ہے۔ صبح سے شام تک اس کے سامنے شدید بھوک کی حالت میں، اچھے سے اچھا کھانا میسر آتا ہے اور وہ نہیں کھاتا۔ شدت کی پیاس ہوتی ہے اور ٹھنڈے پانی کا گھڑا یا شربت کا پیالہ سامنے ہوتا ہے اور وہ منہ نہیں لگاتا۔ مہینوں کے سفر کے بعد گھر واپس آتا ہے اور رفیقۂ حیات پہلو میں ہوتی ہے پھر بھی وہ متوجہ نہیں ہوتا ـــــ یہ سارے مواقع اسے ایسی حالت میں ملتے ہیں کہ اسے کوئی دیکھنے والا، کوئی بدنامی کا خوف، کسی منفعت کا لالچ اور کوئی اخلاقی دباؤ نہیں ہوتا، لیکن وہ ساری نعمتیں جو اس کے لیے شب کو حلال ہیں، دن کو اپنے اوپر خود اپنی خوشی سے حرام کر لیتا ہے۔ وہ کل تک روزے کو فرض سمجھتا تھا اور آج عید کے دن اسے حرام یقین کر لیتا ہے۔ قانون شکنی سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی ہاں صرف ایک جذبہ، ایک روح اور ایک کیفیتِ خاص ہوتی ہے جو اُسے قانونِ الٰہی کی بغاوت سے روک دیتی ہے اور اسی کا نام تقویٰ اللہ ہے۔ وہ قانونِ صوم کے مقنن سے خوفِ عذاب اور رجاءِ ثواب اس لیے رکھتا ہے کہ وہ اسے حاضر و ناظر جانتا ہے، حی و قیوم سمجھتا ہے، اور اس کی سبوحیت و قدوسیت پر ایمان رکھتا ہے۔ اگر اس کا یہ تقویٰ بالکل غیر شعوری نہ ہو تو ہر جگہ اطاعتِ قانونِ الٰہی میں روح کی طرح کام کرتا ہے۔ اور اگر واقعتاً وہ "صائم سائح" ہے تو اس کے کردار کی بلندی دماغِ انسانی کی پرواز سے بھی پرے ہوتی ہے

جب اس نوعیت کا تقویٰ پیدا ہوتا ہے تب اسی بنیاد پر وہ نظامِ زندگی تعمیر ہوتا ہے جسے انجیلی زبان میں "خدا کی بادشاہت" اور قرآنی اصطلاح میں "دین اللہ" کہتے ہیں۔ خدا اپنے بندوں سے محض ایک نظامِ سیاست کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اپنے دین کی اقامت چاہتا ہے۔ دین اُس ہمہ گیر نظام کو کہتے ہیں جس کا ضابطہ زندگی کے ہر شعبہ پر یکساں حاوی ہو۔ انفراد سے لے کر اجتماع تک ہر نظام اسی کے سانچے میں ڈھلا ہو، اسی کا نظامِ اخلاق، اسی کا نظامِ سیاست، اسی کا نظامِ تمدن،

اسی کا نظامِ معیشت اور اسی کے سارے نظامات ہوں حتیٰ کہ طرزِ فکر اور نظریہ ترک و اختیار اور معیار پسند و ناپسند سب کے سب اسی ہمہ گیر قانون کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ یہ دین وہی افراد قائم کر سکتے ہیں جن کے اندر نظامِ اطاعت کی وہ روح موجود ہو جو صوم سے مطلوب ہے۔ اس کے دو جز ہیں جو باہم مل کر ایک نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہے ہر غیر اللہ کی غلامی سے نکل جانا۔ دوسرا ہے ہر غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجانا۔ اب دیکھو روزہ کس طرح ان دونوں مقصدوں پر حاوی ہے۔

انسان یا تو دوسروں کے حکم کا بندہ ہوتا ہے یا اپنی خواہش کا۔ غیر اللہ دونوں ہیں۔ اگر دوسرے حکم چلانے والے وہ ہیں جو صرف اللہ کا حکم چلاتے ہیں جب تو وہ عین اللہ کی اطاعت و بندگی ہے لیکن اگر وہ اپنا حکم یا قانون یا فیصلہ منواتے ہیں تو سراسر طاغوت ہیں۔ مثلاً حکومت کافرہ، یا اس سے کم وسعت کے ساتھ برادری۔ ان دونوں کے احکام و قوانین اور فیصلوں سے الگ رہنا نسبتہً سہل ہے۔ ایک حکومت کے حدود میں رہ کر کسی پہاڑ پر زندگی بسر کیجیے یا جنگل میں قیام اختیار کر لیجیے۔ بہت حد تک اور ممکن ہے ساری عمر دونوں کی زد سے آپ بچ جائیں گے۔ آپ کو ان کے قوانین پر عمل کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی یا آئے گی تو بہت کم آئے گی۔ اور اگر آپ حدودِ مملکت یا حدودِ برادری سے ہی باہر ہو جائیں تو اور بھی آزاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن جس کی غلامی سے آزادی حاصل ہونا سخت دشوار ہے وہ ہے اپنا نفس۔ جہاں اور جس حال میں بھی کوئی ہوگا اس کا نفس اور نفس کی خواہشیں ساتھ ہوں گی اور اپنے حکم کی تعمیل کراتی رہیں گی۔ اس لیے خدا سب سے پہلے جس شے کی بندگی و غلامی و بندگی و اطاعت سے انسان کو نکالنا چاہتا ہے وہ خود انسان کی اپنی خواہشِ نفس ہے۔ اسلامی اسٹیٹ (دین اللہ) انسان پر خود اس انسان کی حکومت و ملکیت بھی نہیں تسلیم کرتا چہ جائے کہ دوسرے انسانوں کی۔

خود انسان کی قائم کردہ حکومت کو دیکھو۔ تم اپنی مرضی سے اگر دشمن ملک میں چندہ بھیجو تو حکومت اس کی روادار نہیں ہو سکتی لیکن حکومت خود جب چاہے تمھارا مال اپنی ضرورت کے لیے بلا تکلف لے سکتی ہے۔ تم اپنی مرضی سے اگر مرنا چاہو ڈوب کر یا جل کر، زہر کھا کر یا کسی طرح خودکشی کر کے، تو حکومت فوراً روک دے گی لیکن جب اُسے خود ضرورت ہو تو جبری بھرتی کا حکم دے سکتی ہے۔ گویا تمھارا مال تمھارا نہیں، تمھاری جان تمھاری نہیں بلکہ یہ سب حکومت کی ملک (STATE PROPERTY) ہے ــــ باایں ہمہ انسانی حکومتوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہونے پر بھی دیکھ لو کتنا تنگ ہے۔ کوئی خنزیر

کھائے، شراب پیے، زنا کرے، جھوٹ بولے، کلب میں برج کھیلے، ناچ رنگ میں زندگی گذارے، دل میں بغاوت کی تدبیریں سوچتا رہے، اپنے ذہن میں پورے نظامِ حکومت کو سو سو گالیاں دیتا رہے خدائی کا دعویٰ کرے، نبوت کا ادعا کرے اور زبان پر ذو معنیین الفاظِ بغاوت لایا کرے، غرض اپنا پرائیویٹ نظامِ زندگی اور بہت حد تک اپنی پبلک زندگی جیسی چاہے بناتا پھرے، حکومت کا کوئی قانون دخیل نہیں ہو سکتا۔ لیکن برعکس اس کے اسلامی اسٹیٹ نہ صرف جان و مال کو بلکہ ان تمام اعضاء و جوارح کو بھی جن سے کوئی فعل صادر ہو سکے، ان تمام قوائے ظاہرہ و باطنہ کو جن سے کوئی کام لیا جا سکے، اس زبان کو جس سے کوئی گفتار نکل سکے، اس دل کو جس کے اندر کوئی نیت پیدا ہو سکے اور اس نفس کو جو کوئی خواہش و ارادہ کر سکے، غرض ایک ایک شیٔ کو اللہ کی اور صرف اللہ کی ملکیت تصور کرتا ہے جو انسان کو محض بطور امانت سپرد کی گئی ہے یہ سب فطرۃً (DIVINE STATE PROPERTY) یعنی خدائی حکومت کی بلا شرکت ملکیتیں ہیں۔ ان میں سے کسی شے پر خود اس انسان کی حکومت و ملکیت تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ ان کے استعمال اور طریقِ استعمال کا اختیار بھی انسان کو نہیں، حتیٰ کہ جن قوتوں کے استعمال پر وہ فطرۃً مجبور و مجبول ہے ان پر بھی اسے اختیارِ استعمال حاصل نہیں کہ جس قوت سے چاہے، جہاں چاہے، جب اور جس طرح چاہے کام لے۔ اگر انسان اسلامی اسٹیٹ اور مالک الملک کی وفادار رعایا بننا چاہتا ہے تو اسے اپنی ساری زندگی میں ایک ایک قدم پر ہر امانت کے استعمال کے لیے اسی ملکُ الناس کے قانون کا پابند ہو کر رہنا پڑے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے، زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، کانوں سے حتیٰ کہ دل و دماغ سے وہی اور اسی طرح کام لے سکتا ہے جو کچھ اور جس طرح ان نعمتوں اور امانتوں کا سپرد کرنے والا حکم یا اجازت دے۔ وہ اپنی خواہش سے کھا پی بھی نہیں سکتا، اپنی رفیقۂ زندگی سے بھی اپنی مرضی کے مطابق تمتع حاصل کرنے کا مجاز نہیں، اپنی وہ قوتیں بھی اپنی رضا و آمادگی اور خوش دلی کے ساتھ اسی مالک کے سپرد کرنی ہوں گی جن کے استعمال پر ہر آن اس کی فطرت اندر سے ابھارتی رہتی ہے۔ یعنی جب آقا کہے کہ فلاں شئے کھاؤ پیو اور فلاں چیز سے تمتع حاصل کرو تو وہ ان ہی چیزوں پر قناعت کر لے اور جب وہ حکم دے کہ یہ ساری چیزیں فلاں وقت سے فلاں وقت تک چھوڑ دو تو وہ وہیں اور اسی طرح تعمیلِ حکم کرے۔ وہ جس شئے کو جب حلال کر دے تو حلال سمجھے اور جسے حرام کر دے تو حرام ہی جانے۔ اور اپنے کردار سے واضح کر دے کہ اب ہم خود بھی اپنے مالک

نہیں چہ جائیکہ دوسروں کے مملوک ہوں اور ہم پر اب خود ہماری خواہشوں کی بھی حکومت نہیں چہ جائیکہ دوسرے کی ہو۔ صوم اسی تسلیم و رضا کی مشق کا دوسرا نام ہے۔

یہ پہلا جزء ہے، یعنی صرف لا الٰہ ہے جس میں ہر غیر اللہ کی حاکمیت و متبوعیت کی نفی ہے۔ اس کا دوسرا جزء الا اللہ ہے۔ اور درحقیقت الا اللہ کے لیے صحیح جگہ ہی اس وقت نکلتی ہے جب لا الٰہ کی تکمیل ہو جائے۔ ورنہ لا الٰہ کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا الا اللہ کے لیے اسی قدر جگہ تنگ ہوگی۔ لا الٰہ سے نفیِ غیر ہو جاتی ہے لیکن مقصود صرف نفیِ غیر اللہ نہیں بلکہ ہر منفی کی جگہ مثبت کو لے آنا مقصود ہے اور وہ مثبت الا اللہ ہے یعنی جب انسان اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم نہ دوسروں کے مملوک ہیں نہ خود اپنی ملک ہیں، نہ ہم دوسروں کے حکم و اختیار کے تابع ہیں نہ اپنے، تو آخر وہ کس کا عبد، کس کا غلام و محکوم اور کس کے حکم و قانون کا تابع فرمان ہے؟ صوم اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ ہم نے فقط اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ ہر خویش و بیگانہ کے حکم سے نکل آئے ہیں بلکہ ہر طرح کے حکم و حکومت سے نکل کر اللہ کی حکومت و حکم میں آ گئے ہیں۔ اپنی اور ہر غیر اللہ کی غلامی سے نکل کر اللہ کی عبدیت میں داخل ہو گئے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ٹھیک طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک صرف اپنے نفس کی مخالفت کی نیت سے مفطراتِ ثلاثہ سے کامل پرہیز رکھے، یا کسی معالج کے کہنے سے ایسا کرے یا جیل خانے میں اس کا مقاطعۂ جوعی (HUNGER STRIKE) بالکل صومی انداز و مقدار کا ہو، یا یہ سب کچھ وہ کسی مجبوری سے محض اپنے ارادے سے کرے لیکن پھر بھی یہ صوم نہ ہوگا۔ فاقہ ہوگا، جوگ ہوگا، برت ہوگا، ہنگر اسٹرائک ہوگی، شرارتِ نفس ہوگی، سب کچھ ہوگا مگر صوم نہ ہوگا۔ یہ ساری باتیں ایک مسلم اور خدا کا وفادار بھی کر سکتا ہے اور ایک خدا کا باغی کافر بھی کر سکتا ہے۔ ظاہری شکل دونوں کے فاقے کی یکساں ہوگی لیکن دونوں میں خطِ امتیاز کھینچنے والی شئے صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی محکومی و غلامی اور اس کی عبدیت و اطاعت کی نیت اور ابتغائے مرضات اللہ کا جذبہ۔ یہی ہے وہ روحِ قانون اور تقوی اللہ جو صرف نفیِ غیر اللہ پر قناعت نہیں کرتا، یہ وہاں جا کر دم لیتا ہے جہاں اُسے الا اللہ کی بھی پوری تجلی نظر آ جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان خالص عبد بنتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہ کچھ کرتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ سوچتا ہے

اور اگر وصفِ صائم نہیں بلکہ واقعتہً سائح بھی ہوتا ہے تو وہ اپنی زبان سے قولِ زُور اور فحش اور غیبت نہیں نکالتا غصہ نہیں کرتا، حتیٰ کہ بے ضرورت گفتگو بھی نہیں کرتا وہی بولتا ہے جس میں اللہ کی رضا ہو۔ اس طرح وہ صرف معدے کا روزہ نہیں رکھتا بلکہ اس کے سارے اعضا و جوارح صائم سائح بن جاتے ہیں اور اس کا قلب و دماغ بھی روزہ رکھتا ہے۔ "چشم بند و گوش بند و لب ببند" کے معنی "سلطان الاذکار" کے سمجھے جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی ہو لیکن یہ عبدیت کی اصل نہیں۔ "چشم بندن" کے معنی ان تمام چیزوں سے نظر ہٹا لینے کے ہیں جو اللہ کی رضا کے مطابق نہ ہوں اور یہی مطلب "گوش بندن" اور "لب بندن" کا ہے۔ قابلِ غور ہے حدیثِ قدسی کا یہ مضمون کہ "جب بندہ میری جانب ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک گز اس کی طرف بڑھتا ہوں، وہ خراماں خراماں میری طرف آتا ہے تو میں اس کی طرف لپکتا اور دوڑتا ہوا آتا ہوں، یہاں تک کہ میں خود اس کے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ حرکت کرتا ہے اور اس کے وہ کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے ...... فداہ ابی وامی۔ صدق صلی اللہ علیہ وسلم — اس حدیثِ قدسی میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے میں حلول کر جاتا ہے یا "ہمہ اوست" بن جاتا ہے اور بندہ جو جی چاہے کرے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اپنے اندر انابت الی اللہ کا صحیح جذبہ پیدا کر کے اسی کے مطابق سعی و کوشش شروع کرتا ہے تو رحمتِ الٰہی اتنی تیزی سے اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے کہ بندہ گمان بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس عبد کو اتنا قرب و استرضائے الٰہی میں آخرکار ایسی فنائیتِ تامہ ہو جاتی ہے کہ اس کے اعضاء و جوارح کا کوئی حرکت و سکون مرضی مولا کے خلاف نہیں ہوتا۔ جو کچھ کرتا، بولتا یا سوچتا ہے قانونِ الٰہی کے مطابق اور اسی کی ہدایت و حکم کے موافق۔

ایسے عبد کا نمونہ اگر دیکھنا چاہو تو کسی صائم سائح کو دیکھ لو جو اپنے طرزِ عمل سے واضح کر دیتا ہے کہ ہم صرف اللہ کے عبد ہیں اور فقط اسی کے حکم و قانون کو مانتے ہیں۔ وہ ایک حلال شے کو ہم پر جب حرام کرتا ہے تو عملاً ہم حرام سمجھ لیتے ہیں؛ اور جب حلال کرتا ہے تو عملی طور پر حلال مان لیتے ہیں — یہی تو وہ عبد ہے جو کسی غیر اللہ کے قانونِ تحلیل و تحریم کو سرے سے نہیں تسلیم کرتا جب وہ بنیادِ صوم ہی اس عقیدے پر رکھتا ہے کہ اور تو اور ہم خود بھی اپنے اوپر حاکم نہیں تو اس کے لیے کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ کسی طاغوت اور خدا کے باغی کے کسی قانون کو تسلیم کر کے اس کی حاکمیت و ربوبیت کو مان لے،

خصوصاً قانونِ حلّت و حرمت کو؟

ہر سال ہمیں کامل ایک ماہ اس عقیدے کی عملی مشق کرائی جاتی ہے کہ کسی شئے کے لیے حلت و حرمت کا حکم و قانون دینے کا اختیار صرف خدا کا حق ہے اور اس میں کوئی کسی حیثیت سے شریک نہیں، اور ہم شاید یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہر قسم کی قانون سازی کا اختیار بندوں کو بھی حاصل ہے اور یہ حق بندوں کے لیے تسلیم کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں یہی نہیں بلکہ اُس کے حق میں بھی یہ اختیار تسلیم کرنے میں مضائقہ نہیں جانتے جو علانیہ قوانینِ الٰہی توڑ دے اور اپنی وہ مجلسِ آئین ساز بنائے جس کی بنیاد خدا کے بجائے بندوں کی اطاعت اور حلفِ وفاداری ہو ایسے طاغوت کا تو وہ قانون بھی قابلِ تسلیم نہیں جو عین مطابق قانونِ الٰہی ہو، جو خود مطیع الٰہی نہیں اس کا کوئی حکم، کوئی قانون اور کوئی فیصلہ خدا کے وفاداروں کے لیے قابلِ تسلیم ہی نہیں خواہ وہ بظاہر قانونِ الٰہی کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

اسے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر آپ کسی حکومت میں رہ کر کرنسی نوٹ چھاپیں اور چلائیں تو حکومت پکڑے گی آپ ہزار کہیں کہ صاحب یہ نوٹ بالکل آپ کے نوٹ کے مطابق ہے، وہی کاغذ، وہی تصویر، وہی عبارت، وہی دستخط اور وہی بیل بوٹے ہیں، لیکن آپ ہرگز اسے بچ نہیں سکتے کیونکہ آپ کا نوٹ اگرچہ عین حکومتی نوٹ کے مطابق ہے لیکن صرف اس لیے آپ پکڑے جائیں گے کہ آپ کو یہ حق و اختیار حکومت نے نہیں دیا ہے اور اس کا چلانا متوازی حکومت (PARELLEL GOVERNMENT) قائم کرنے کا باغیانہ اعلان ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس بادشاہِ کائنات کی خدائی، اس کی سلطنت اور اس کی زمین و آسمان میں رہ کر کسی کو بطور خود قانون بنانے اور اسے چلانے کا مطلقاً کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا کرنا باغیانہ متوازی حکومت قائم کرنے کا مرادف ہے۔ وہ جعلی کرنسی نوٹ کی طرح ٹھیک الٰہی قانون کے مطابق بھی قانون بنانے یا چلانے کا حق نہیں رکھتا۔ ہاں قانون سازی ـــ وہ بھی جزئی ـــ کا حق صرف ایک شکل میں تسلیم ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے وہ اللہ کو اپنا واحد بادشاہ تسلیم کرے اور اس کی کسی قائم کردہ حد کو نہ توڑے۔ اس صورت میں اس کی حیثیت صرف خلیفۃ اللہ یا نائبِ حکومت (VICE GERENT OF ALLAH) کی ہو گی یا ان طابعین و ناشرین کی جو حکومت کی اجازت و حکم سے کرنسی نوٹ طبع کرتے ہیں پس کسی عالم یا درویش کو، کسی مجلسِ آئین ساز کو، کسی برادری کو، کسی ڈکٹیٹر

اور کسی صدر جمہوریہ کو یہ حق نہیں کہ وہ قانونِ الٰہی کو توڑے اور اپنا قانون بنائے اور چلائے۔ اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ کے نزول کے بعد حضرت عدیؓ بن حاتم دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ہم نے تو کبھی اپنے علماء و مشائخ کو رب نہیں بنایا۔ حضور فرماتے ہیں کہ کیا تم ان کے حلال کردہ کو حلال اور ان کے حرام کردہ کو حرام نہیں سمجھ لیتے تھے؟ عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ۔ حضور فرماتے ہیں کہ بس یہی ہے رب بنانا۔

اب ذرا یہ سوچو کہ وہ صائم کتنے مغالطہ میں ہے جو ایک طرف تو روزہ رکھ کر یہ اعلان کرتا ہے کہ تقنینِ حلال و حرام میں ہم نے اپنا رب اللہ کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن اُسی آن وہ یہ خالص ربانی حق تقنین خدا کے باغیوں کے سپرد بھی کرتا ہے۔ جو حق اللہ نے کسی ولی، کسی امام، کسی صحابی اور کسی پیغمبر تک کو نہیں دیا وہ حق ۔۔۔ صرف تحلیل و تحریم ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے سارے مسائل و مراحل میں ۔۔۔ کسی ڈکٹیٹر، کسی صدر جمہوریہ اور کسی مجلسِ قانون ساز کے لیے تسلیم کرنے اور اسے جائز مان لینے کے بعد اقرارِ عبدیتِ الٰہی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے اور ایسے عبد کا صرف صائم ہو جانا فاقہ کشی سے زیادہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ ایمان تو ہم رکھ سکتے ہیں کہ یہ طواغیت اور یہ باغیانِ خدا نہ ہمارے حاکم ہیں نہ مقنن و حکَم، نہ قابلِ اطاعت ہیں نہ قابلِ معاونت۔ اگر یہ ایمان بھی نہیں رکھ سکتے تو لیس وراء ذالک حبة خردل من الایمان اس کے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔

ہم نے صوم کے صرف بنیادی حقائق و مقتضیات پر تبصرہ کیا ہے۔ اس لیے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں، اصل کے ہاتھ آجانے پر فروع خود حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن بے محل نہ ہوگا اگر باقی اُمور پر بھی محض سرسری نظر ڈال لی جائے تاکہ صائم ہمیشہ اپنے صوم کا جائزہ لے کر دیکھ سکے کہ وہ تقاضائے صوم کو کہاں تک پورا کر رہا ہے۔

(۱) صوم کا سب سے بڑا فائدہ (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) تو یہ ہے کہ انسان اس اکیلے بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت و وفاداری میں آجاتا ہے اور اپنے نفس کا خود محاسب بن جاتا ہے۔ وہ چاہے تو تنہائی میں بغاوت کر لے مگر ایک حاضر و ناظر شہنشاہ کی حکومت اس خلوت میں بھی اس پر مسلط رہتی ہے جہاں اسے کوئی نہیں دیکھتا اور جہاں وہ کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔

(۲) محاسبہ نفس کے علاوہ اس میں ضبطِ نفس بھی پیدا ہو جاتا ہے اور تحمل و صبر بھی۔ جو شخص خور و نوش اور تسکینِ حیوانیت

جیسے کٹھن جذبات کا مردانہ وار مقابلہ کرے وہ دنیا کے تمام شدائد و مصائب کا بآسانی مقابلہ کر سکتا ہے۔

(۳) نعمتوں کی صحیح قدردانی بھی ایک صائم ہی میں ہو سکتی ہے۔ ترک لذت کے بعد اس کے حصول میں جو لطف ہی اسے وہ کیا جانے جس نے ترکِ لذات کی لذت ہی نہ چکھی ہو۔ اس قدر نعمت کا لازمی نتیجہ جذبۂ شکر کا ازدیاد ہے۔

(۴) صحیح انسانی ہمدردی کا جذبہ ایک صائم ہی کے اندر ہو سکتا ہے۔ جس نے کچھ تکلیفیں جھیلی ہوں وہی دوسروں کی تکلیفوں کا بھی احساس کر سکتا ہے۔

(۵) پوری جماعت میں ہم رنگی و مساوات کا عجیب سبق صوم سے حاصل ہوتا ہے۔ بڑے چھوٹے سب ایک اکیلے فرمانروا کی اطاعت میں یکرنگ ہو جاتے ہیں۔ امیر اپنے کو غریبوں جیسا بھوکا اور غریب امیروں کو اپنے جیسا مجبور پاتا ہے اور اس طرح سرمایہ دار و مزدور کی ٹکر کا جذبہ بڑی حد تک فنا ہو جاتا ہے۔

(۶) صیام رمضان کے بعد لاکھوں روپے بشکل فطرہ غریبوں کی جیب میں جاتے ہیں جس سے غربا کی بھی عید ہو جاتی ہے۔ اس معاشی نظام و تقسیم کا سبب دراصل ماہ صیام ہی ہے۔

(۷) تقویٰ بڑے بلند درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو "حلال" کو رضائے الٰہی کے لیے ترک دے وہ حرام کو اختیار کر کے اس کی ناراضی کیوں مول لینے لگا۔ گویا صائم کا معیارِ ترک و اختیار بدل جاتا ہے اور اس کا طرزِ فکر الٰہی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ دیگر حقائق صوم، صائم پر خود بخود منکشف ہو جاتے ہیں اگر وہ روزہ رکھنے کے ساتھ غور و فکر بھی کرے۔ یہ تو وہ فوائد ہیں جو اسی زندگی میں حاصل ہوتے ہیں۔ اخروی منافع کا تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ حدیث قدسی کے یہ الفاظ عجیب فرحت بخشِ روح ہیں کہ کل حسنة بعشر امثالها الی سبعمائة ضعف الا الصوم فانه لی وانا اجزی به۔ ہر نیکی کا اجر دس سے لے کر سات سو گنے تک ہے بجز صوم کے کہ وہ تو خاص میرے لیے ہے یا اس کا اجر میرے ذمہ ہے اور اس کا اجر تو بس میں ہی دوں گا ۔۔۔ اللہ اللہ اس "لی" کی لطافت اور اس اَنَا اَجْزِیْ بِہٖ کی وسعت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ نماز نہ پڑھو تو پکڑے جاؤ، زکوٰۃ نہ ادا کرو تو داروگیر شروع ہو جائے، حج نہ کرو تو بازپرس کی بوچھار ہو۔ ان میں سے کوئی ارکانِ دین ایسا نہیں جو چھپا کر کیا جاتا ہو۔ سب میں اظہار لازمی ہوتا ہے اور کسی سے بغیر مواخذے کے

گریز ہی دشوار ہے لیکن صرف ایک ہی رکن صوم ایسا ہے جس سے گریز ہر وقت ممکن ہے لیکن خدا کا بندہ یہ خیانت نہیں کرتا۔ وہ جب چاہے تنہائی میں اپنا روزہ توڑ دے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ کیوں؟ کچھ نہ کچھ تو للہیت ہوتی ہوگی۔ اگر یہ عبادت صحیح طور پر ادا ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خالص اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ اور یہ "لی" اس خالصیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پھر اس کے اجر کا اندازہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ بندوں کی پیمائش سے اس کے اجر کا طول و عرض نہیں معلوم کیا جا سکتا، اس لیے خدا نے خود اس کا ذمہ لے لیا ہے کہ انا اَجْزِی بِہ۔ اس کی جزا تو بس میں ہی دوں گا۔ اس مولا کی کریمی دیکھو چند فاقوں کا کتنا بے حساب اجر دینے پر آمادہ ہے۔ ایک شہنشاہ صلہ دینے کا وعدہ فرماتا ہے اور صلہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ خود ہی اس کی کوئی تحدید نہیں فرماتا۔ اللہ کے روزہ دار بندو! اپنی قسمت پر ناز کرو، وہ داتا کیا کچھ دینے پر تلا ہوا ہے۔ انا اَجزِی بہ کو انا اُجْزیٰ بہ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی میں خود اس کی جزا بن جاتا ہوں۔ اور اس کا اجر یہ ہے کہ میں خود اسے اجر میں مل جاتا ہوں۔

اس کے خود مل جانے پر کوئی تعجب نہیں اس لیے کہ "تخلّق باخلاق اللہ" کا صحیح نقش شاید صوم سے بڑھ کر کسی عبادت میں نہیں۔ تخلّق باخلاق اللہ کے معنی ہیں مولا کے رنگ میں رنگ جانا اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا۔ اس کی توحید خالص سورۂ اخلاص میں یوں بیان ہوئی ہے "اللہ بے نیاز ہے، وہ جورو بچے کا محتاج ہے نہ کھانے پینے کا"۔ پس جو اللہ سے تقرب چاہتا ہے وہ اپنے کو کچھ دیر کے لیے سہی اسی رنگ صمدانیت میں رنگ لے اور جس طرح اس کا مولیٰ ان تمام مادی حوائج سے بے پرواہ ہے اسی طرح وہ بھی ہو جائے۔ پھر قرب الٰہی کا اندازہ کرے اور دیکھے کہ کس طرح اس کا آقا ہی اس کا اجر بن کر مل جاتا ہے۔ جزا میں اس کے ملنے کا مطلب اس کو اپنے قبضہ میں لے آنا نہیں بلکہ اس کی رضا کا حاصل ہو جانا ہی عین اسی کا مل جانا ہے۔

لب فرو بند از طعام و از شراب سوئے خوانِ آسمانی کن شتاب

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journals and Dailies of India have highly spoken of this little book. Order your copy just now. Price Rs. 1-8. Available from, The Manager, Tarjuman-ul-Quran, Lahore.

Attempt at a clear

رسالۂ دینیات

رسالۂ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۲ر محصول ڈاک ۲ر خرچ وی پی ۳

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

[illegible] پریس [illegible] روڈ لاہور میں طبع ہوا